بعدِ او نا ید چو او مردِ فقیر

جون کا پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ یہ دلدوز و جگر سوز خبر ملی کہ علامہ حافظ سید محب الحق صاحب قبلہ ۲۵، ۲۶ مئی کی درمیانی شب کو رحلت فرما گئے ہیں۔ فھو فی عیشۃ راضیہ

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے جو حضرات علامہ مرحوم سے پہلے واقف نہیں تھے، وہ اُن سے محترم پرویز صاحب کے اس مضمون کے ذریعے متعارف ہو چکے ہیں جو جولائی ۱۹۳۹ء کے طلوعِ اسلام میں "ایک نورانی صبح" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ کبر سنی، مسلسل عوارض اور تقسیم ہند کے ضمنی عواقب کی وجہ سے حافظ صاحب مغفور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شروع مئی میں وہ لاہور تشریف لے جانے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ خیال یہ تھا کہ وہاں کی آب و ہوا ان کی صحت پر اچھا اثر کرے گی۔ ان سے جب لاہور کا ذکر آتا تو فرماتے کہ وہاں عرشی صاحب کی قرآنی جماعت ہے، ان سے قرآن پر باتیں ہوا کریں گی۔ ۲۷ مئی کو روانگی کا خیال تھا کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اور چند ہی روز بعد وہ انتقال فرما گئے۔

علامہ مرحوم کی عمر وفات کے وقت سو سال کے قریب ہو گی۔ فرمایا کرتے تھے کہ شروع جوانی ہی سے قرآن نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ خدا کی یہ کتاب، اکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اپنی تفسیر کے لئے کسی خارجی خیال کی محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی تمام عمر حسبنا کتاب اللہ کی دعوت و تبلیغ میں صرف کر دی اور آخری وقت تک قرآن اور قرآن ہی زبان پر رہا۔ کس قدر قابلِ رشک ہے یہ زندگی اور کیسی پر سعادت ہے یہ موت۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔

جنھیں علامہ مرحوم سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوتی تھی وہ اس پر شاہد ہیں کہ ان کی محفل میں اللہ کی اطاعت کے سوا اور کوئی موضوعِ گفتگو کا ہوتا ہی نہ تھا۔ آخری وقت تک بھی یہ عالم تھا کہ ضعف و ناتواں کے ہاتھوں سانس تک لینا دشوار ہے لیکن یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی جائے اور قرآن کا ذکر چھیڑے بغیر

واپس آجائے۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ ان کی علالت کی اطلاع پاکر محترم پرویز صاحب، ڈاکٹر حمید صاحب کو لیکر گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے مرض کے متعلق تو صرف ایک آدھ بات ہوئی اور باقی سارا وقت پرویز صاحب کے ساتھ قرآن پر گفتگو ہوتی رہی اور اس جذب و شوق سے کہ اس دوران میں کسی کو گمان تک بھی نہیں گذر سکتا تھا کہ آپ بیمار ہیں۔ قرآن کے ساتھ ایسا عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔

افسوس کہ اس آخری وقت میں نہ ڈاکٹر حمید صاحب ان کے پاس تھے نہ پرویز صاحب۔ اول الذکر یورپ جا چکے تھے اور ثانی الذکر اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر کوئٹہ میں تھے۔ انھیں یقیناً اس کا افسوس رہے گا۔

قرآنی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں شرعۃ الحق، دعوت الحق، منہاج الحق اور بلاغ الحق ان کی مستقل تصانیف ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کتابیں ایک عرصہ سے طبع نہیں ہوئیں۔ خدا کرے کہ ادارۂ طلوع اسلام کو یہ توفیق نصیب ہو جائے کہ وہ اس سلسلہ کی اشاعت کا انتظام کر سکے۔

قرآن کے خدام پہلے ہی خال خال دکھائی دیتے ہیں اور جو جاتا ہے اپنی کرسی خالی چھوڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف، اس شمع خداوندی کو بجھانے یا اس پر انسانی تصورات کے غلاف ڈالنے والی قوتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ان حالات کے ماتحت ایک سوچنے والے کا دل ڈوب جاتا ہے۔ لیکن، بایں ہمہ، مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں اپنی سی کئے جانا چاہئے۔ قرآن کو محفوظ رکھا ہی اس لئے گیا ہے کہ اسے آخر الامر نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات بننا ہے یہ ہو کر رہے گا۔ ولو کرہ المشرکون۔ لہٰذا غم کاہے کا؟

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام — کراچی

بدل اشتراک	مہتمم	قیمت فی پرچہ
سالانہ پانچ روپیہ پاکستانی (چھ روپیہ ہندوستانی)	محمد یونس	آٹھ آنے (پاکستانی)
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۷	جولائی سنہ ۱۹۵۰ء	جلد ۳

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
بعداو نابرچرا دمردِ فقیر	۱ - ۲
لمعات	۳ - ۸
(بقیہ لمعات)	۶۱ - ۶۳
باب المراسلات (مہاجرین کا مسئلہ)	۹ - ۱۵
عہد حاضر کے مسائل اور ان کا حل (نذر الباقر صاحب)	۱۶ - ۲۷
مثنوی اسرار خودی (علامہ اسلم جیراجپوری)	۲۸ - ۴۰
اوقاتِ نماز	۴۱ - ۴۷
۱- خواجہ عباد اللہ اختر صاحب	
۲- داعی الی الحق	
۳- بشیر احمد سوتی صاحب	
قرآن اور مسئلہ جبر و قدر (ع غنی صاحب)	۴۸ - ۵۵
نقد و نظر	۵۶ - ۶۰
حکومتِ حق (نظم) (اسد ملتانی)	۶۴
رفتارِ عالم	۶۵ - ۷۴
قرآن اور حدیث (علامہ اسلم جیراجپوری)	۷۵ - ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہمیں قارئینِ طلوعِ اسلام کی طرف سے استفسارات موصول ہو رہے ہیں کہ جب جماعتِ اسلامی بھی ملک میں قانونِ شریعت کا نفاذ چاہتی ہے اور طلوعِ اسلام کا مسلک بھی یہی ہے تو پھر طلوعِ اسلام، جماعتِ اسلامی کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے طلوعِ اسلام کی دو تین اشاعتوں میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ لیکن ان استفسارات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس باب میں مزید تصریح کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے یہ کہا جاتا ہے کہ جماعتِ اسلامی احیاءِ دین کی مدعی ہے، اس لئے اس کی مخالفت درست نہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا کسی فرد یا جماعت کا یہ دعویٰ کہ وہ دین کا احیاء یا قانونِ شریعت کا نفاذ چاہتی ہے تنہا اس امر کی دلیل بن سکتا ہے کہ اس فرد یا جماعت کی مخالفت دین اور شریعت کی مخالفت ہے؟ قرنِ اول سے آج تک مسلمانوں کی تاریخ پر غور کیجئے، کتنے فتنے تھے جو خود مسلمانوں میں سے اسلام کی تخریب کے لئے اٹھے۔ کیا ان میں سے کوئی بھی ایسا تھا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں دین کو مٹانے یا شریعت کو نیست و نابود کرنے کیلئے میدان میں آیا ہوں؟ ان میں سے ہر ایک یہی دعویٰ لیکر اٹھا تھا کہ وہ دین کی احیاء اور شریعت کے نفاذ کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہے۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ اسی دعوے کی بنیادوں پر اٹھا اور اسی دعوت کے سہارے کھڑا رہا۔ اور تو اور، مدعیانِ نبوت تک نے یہ نہیں کہا کہ وہ اسلام کو مٹانے اور شریعت کو تباہ کرنے کے لئے "مبعوث" ہوئے ہیں۔ وہ بھی اٹھے تو اپنا دل تھامے ہوئے گویا وہ قوم کے درد میں ڈوبا جا رہا ہے اور یہ کہتے ہوئے کہ وہ تجدیدِ دین اور احیاءِ شریعت کے لئے "مامور" ہوئے ہیں۔ ان حالات کے ماتحت کسی جماعت کے برسرِ حق ہونے کے لئے محض یہ دلیل کہ اس کا دعویٰ شریعت کا نفاذ ہے کچھ وزن نہیں رکھتی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسی شریعت ہے جس کا نفاذ وہ چاہتی ہے اور وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے وہ اس تحریک کو آگے بڑھا رہی ہے۔

جماعتِ اسلامی کی تحریک کا آغاز اس دعوے سے ہوا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان صرف پیدائشی مسلمان ہیں انہیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے کیلئے جماعتِ اسلامی کے امیر کے ہاتھ پر تجدیدِ ایمان کرنی چاہئے۔ چنانچہ اس جماعت کے پہلے اجتماع میں اس تجدیدِ ایمان کا مظاہرہ بھی کیا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے اراکین یا کم از کم اس کے اربابِ بست و کشاد سچے معنوں میں مسلمان ہیں اور ان کی زندگی وہ معیار ہے جس پر ہر سچے مسلمان کو پورا اترنا چاہئے

چنانچہ جماعتِ اسلامی بار بار اس دعوے کو دہراتی رہتی ہے کہ "اس کی قیادت بہترین افراد کے ہاتھوں میں ہے" یہاں تک کہ اس جماعت کے ایک موید مجلے نے یہ بھی لکھا تھا کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب "اپنے آپ کو چالیس کروڑ مسلمانوں تنہا پاتے ہیں" یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معیاری زندگی کے مدعیوں میں کم از کم دیانت تو ضرور ہونی چاہیئے۔ اب یہ دیکھیئے کہ اس اعتبار سے واقعات ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔

اس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے، جماعتِ اسلامی تحریکِ پاکستان کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتی تھی۔ یہانتک کہ وہ اس تحریک میں چھوٹے سے چھوٹے تعاون کو بھی تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور معصیت کے کاموں میں معاونت) تصور کرتی تھی۔ چنانچہ یہ جماعت آخر تک تحریکِ پاکستان کی شدت سے مخالفت کرتی رہی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد یہی جماعت اپنے آپ کو پاکستان کی سچی بہی خواہ بتا رہی ہے۔ ترجمان القرآن بابت مارچ سنہ ۱۹۵۰ء کے اشارات کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"پاکستان کے تین سچے بہی خواہ جو تحریک اقامت دین کی سربراہ کاری کے جرم میں حوالۂ زنداں کئے گئے تھے" (پاکستان کے یہ تین سچے بہی خواہ ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، امین احسن صاحب اصلاحی اور میاں طفیل محمد ہیں) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو تحریک ابھی کل تک خلافِ اسلام قرار دی جا رہی تھی وہ اپنی کامیابی کے بعد کس طرح سے عین اسلام قرار پا گئی؟ وہی پاکستان جسے اس وقت "زہر ملا حلوہ" کہا جاتا تھا اپنے قیام کے بعد کس طرح منزل من اللہ مائدہ بن گیا جو خاص طور پر مقدسین کے اس طائفہ کے لئے آسمان سے اترا ہے اور جسے کسی "غیر مقدس" کو چھونے تک کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ کیا دیانتداری اسی کا نام ہے؟

اور آگے بڑھیئے۔ پاکستان کی مخالفت میں یہ جماعت دلیل یہ لایا کرتی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیرِ سیرت اور تطہیرِ کردار کی فکر کرنی چاہیئے۔ جب یہ ہو جائے گا تو سلطنت خود بخود ان کے پاؤں چومے گی۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ خارجی حوادث اور ہنگامی واقعات سے حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہندوستان سے انگریزی حکومت کی بساط سمٹتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ہندوؤں کی حکومت کی بساط ساتھ کے ساتھ بچھتی جا رہی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس وقت اپنی جداگانہ آزادی کے لئے جدوجہد نہ کی یا اس میں تساہل برتا تو انہیں صدیوں تک ہندوؤں کا غلام رہنا پڑے گا۔ اس لئے حالات کی تبدیلی کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کو کامیاب بنایا جائے۔ جب اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو تعمیرِ سیرت اور تطہیرِ کردار کیلئے تمام اسباب میسر ہو جائیں گے۔ اس وقت پورے اطمینان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جا سکے گا۔ اس پر ان کا جواب یہ تھا کہ تعمیرِ سیرت کے بغیر مسلمانوں کی آزادی اور ہندوؤں کی غلامی برابر ہے۔ اس لئے اصل کام تعمیرِ سیرت ہے جس کے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا گناہ کا کام ہے۔ یہ تھا ان معیاری مسلمانوں کا مسلک قیامِ پاکستان سے قبل۔ حصولِ پاکستان کے بعد

یہ خود عملی سیاست کے میدان میں آ ترے اور مسائید حکومت و اقتدار پر متمکن ہونے کیلئے پورے جذب و انہماک سے مصروفِ عمل ہو گئے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا اصلی کام تو تعمیرِ سیرت تھا، یہ مسلمانانِ پاکستان کی سیرت کی تبدیلی کے کام کو چھوڑ کر انتخابی مہموں کے پیچھے کیوں پڑ گئی؟ اس کے جواب میں ترجمان القرآن بابت جون سنہ ۱۹۵۰ء کے اشارات میں لفظاً لفظاً وہی کچھ کہا گیا ہے جو تحریکِ پاکستان کے حامی جماعتِ اسلامی سے قیامِ پاکستان سے پہلے کہا کرتے تھے۔ چند فقرے انھیں کے الفاظ میں دیکھئے۔ فرماتے ہیں:-

> جماعتِ اسلامی ابتدائی تیاری (یعنی تعمیرِ سیرت) کے دور کو لمبا کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے میدانِ کار میں طلب کر لیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آویزش دھیمی دھیمی چلی آ رہی تھی وہ تقسیمِ ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جب کہ حالات بتا رہے تھے کہ اس کش مکش کا فیصلہ ادھر یا ادھر بہت جلد ہو جانے والا ہے اور آزادی کے بعد کے ابتدائی پانچ سال (یا زیادہ سے زیادہ دس سال) اسلام کے لئے بالکل فیصلہ کن ہیں تو جماعتِ اسلامی کیلئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ ہمہ تن "عشق" بنے اور "بے خطر آتشِ نمرود" میں کود جائے اور اس موقع پر عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لئے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر ہندو یا الحاد کے رخ پر جانے کے بعد جب کنارے کا ٹتا ہوا اپنی بعد کا مکو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑ دینا ایک محال کام ہو گا۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول، اپنی حریف طاقتوں، اپنے دور کی تاریخ اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن اور سیاست کی ساری بازی شاطرِ الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشہ میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کیلئے آخری ہلہ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقویٰ کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کیلئے گھروں کے دروازے بند کئے بیٹھے رہیں۔

جماعتِ اسلامی کے اس مسلک اور اس مسلک کی تائید میں ان کے پیش کردہ دلائل وغیرہ دیکھئے اور پھر ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر اس پر نظر ڈالئے کہ جب حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران میں ان لوگوں سے یہی کچھ کہا جاتا تھا تو وہ اس قسم کے مسلک کو کس قدر غیر اسلامی اور اس قسم کے دلائل کو کس قدر پر فریب بتایا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک نظامِ سارے کے سارے مسلمان ہندوؤں

کی غلامی میں جکڑے جاتے لیکن تعمیرِ سیرت کا کام موخر نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن آج جب ہوسِ اقتدار انھیں الیکشن لڑنے کے لئے کشاں کشاں کھینچ رہی ہے تو تعمیرِ سیرت کے کام کو چھوڑ کر میدانِ سیاست میں ان کا ہر قدم اسوۂ ابراہیمی کے اتباع میں ہمہ تن عشق بن جاتا ہے اور تعمیرِ سیرت کے "عقلی تقاضوں" کو بے محابا محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے دیانتداری سے مفہوم جماعتِ اسلامی کی لغت میں!

ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جماعتِ اسلامی غیر اسلامی حکومت کی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے کو تحاکم الی الطاغوت (یعنی اپنے مقدمات کے فیصلوں کیلئے غیر خدائی قانون کی طرف رخ کرنا) قرار دیا کرتی تھی۔ اور اپنے اس "تقویٰ" کے اظہار میں اس درجہ شدت برتتی تھی کہ عدالتی کاروبار سے متعلق ملازمتوں تک کو حرام کی روزی قرار دیتی تھی۔ پاکستان میں ابھی تک وہی عدالتی نظام کارفرما ہے جسے یہ جماعت طاغوتی نظام کہا کرتی تھی۔ لیکن اب اسی جماعت کی حالت یہ ہے کہ مودودی صاحب اور ان کے دورِ فقائے کار کی نظر بندی کے سلسلہ میں ان کا مسلسل تقاضا یہ رہا کہ

> حکومت ان کے خلاف سوچ کر متعین جرم عائد کرے اور پھر اسے باقاعدہ عدالت کے سامنے لے آئے جو ملزم کو جوابِ دعویٰ پیش کرنے کا پورا پورا موقع دے اور پھر پبلک لاء کے ماتحت معاملہ کا باقاعدہ فیصلہ ہو۔
>
> (ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ء)

"باقاعدہ عدالت" کی تصریح کرتے ہوئے ترجمان القرآن نے لکھا ہے کہ سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈیننس کے ماتحت کارروائی باقاعدہ عدالتی کارروائی نہیں کہلا سکتی۔ باقاعدہ عدالت وہ ہے جو عام قانون کے ماتحت عدالت کی حیثیت رکھتی ہے۔

خود مودودی صاحب نے اپنی پچھلی پریس کانفرنس میں موجودہ حکومت پاکستان کو غیر اسلامی حکومت قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس حکومت کا عدالتی نظام وہی طاغوتی نظام ہے جس کی طرف رجوع کرنے کو دوسروں کے لئے کفر کا موجب بتلایا جاتا تھا۔ لیکن جب معاملہ خود اپنی ذات کا آپڑا تو بار بار تقاضا کیا جاتا رہا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ اسی طاغوتی عدالت سے ہونا چاہئے اور وہ بھی قرآنی قانون کے ماتحت نہیں بلکہ موجودہ "پبلک لاء" کے ماتحت۔

یہ ہے وہ جماعت جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی زندگیوں نے عہدِ صحابہؓ کے سچے اسلام کے نمونوں کو دوبارہ اجاگر کر دیا ہے!

ایک قدم اور بھی آگے بڑھئے۔ آپ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو دیکھئے۔ اس میں ایک ایک صفحہ پر آپ کو کتاب و سنت کی طرف دعوت اور "اطاعتِ خدا و رسول" کی طرف رجعت کا بلند آہنگ دعویٰ ملے گا۔ سنت یا اطاعتِ رسول سے ان کی مراد یہ ہے کہ جو کچھ احادیثِ نبوی صلعم میں درج ہے اس کی اطاعت عین دین ہے۔ چنانچہ یہ ہر اس فرد یا جماعت کے

خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے ہیں جو روایات کو قرآنی روشنی میں پرکھنے کی جرأت رکھتا ہو۔ا۔ دگی ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ہمہ تن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ دعوے ہے اور دن طرف حالت یہ ہے کہ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ الیکشن لڑنے کیلئے جاگیرداروں اور زمینداروں سے ساز باز ضروری ہے تو جاگیرداری اور زمینداری کو عین اسلام بتانے کیلئے کتابوں پر کتابیں لکھ ماریں۔ قرآن تو ان لوگوں کے نزدیک دین میں سند کی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ اصلی سند ہیں احادیث۔ لیکن بدقسمتی سے ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو زمین کو بٹائی پر دینے کی مخالفت کرتی ہیں۔ یہ مقام ذرا دشوار گذار تھا۔ قرآن سے بھاگ کر روایات کے دامن میں پناہ لینے کے لئے آئے لیکن دیکھا کہ زمینداری کے جواز میں یہاں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ آپ متعجب ہوں گے کہ احیاء سنت کے یہ مدعی اب کونسی راہ فرار اپنے لئے پائیں گے۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات ہی نہیں۔ جن کے نزدیک مذہب صرف ایک ذریعہ ہو حصولِ مقصد کا ان کے لئے گریز کے ہزار دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جناب امیر جماعت اسلامی نے نہایت مجتہدانہ شان سے فرما دیا کہ ان احادیث میں

درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں کسی اور طرح بیان ہو گیا۔

ان روایات کے راوی صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ یا تو یہ صحابہؓ ارشاد رسالت کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکے اور یا (معاذ اللہ) انھوں نے دانستہ کچھ کا کچھ روایت کر دیا۔ آپ شاید یہ سوال کریں کہ خود آپ کو اس کا علم کیسے ہو گیا کہ رسول اللہؐ نے کچھ اور ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن اس کا جواب تو بڑا آسان ہے۔ مودودی صاحب آپ خود سید ہیں اس لئے یہ باتیں تو ان کے اپنے گھرانے کی ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صحیح طور پر نہ جانیں تو کیا شیخ ابوبکرؓ جانیں گے۔ یہ ہی نہیں، بلکہ حدیث کے بارہ میں ان کا مسلک یہ بھی ہے کہ

روایات کے باب میں محدثین کا مستند ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ جن امور کا تعلق عقل، درایت اور فہم و استنباط سے ہے ان میں بھی وہ بالکل مستند سمجھے جائیں۔

یعنی جب قرآن اپنے مقصد کے خلاف جائے تو کہدیا کہ قرآن کا صحیح مفہوم احادیث میں مل سکتا ہے اور جب احادیث اپنے مطلب کے خلاف جائیں تو کہدیا کہ نامعلوم رسول اللہؐ نے کیا ارشاد فرمایا اور صحابہؓ نے کیا روایت کر دیا۔ اور اگر کسی نے کسی روایت کا "مستند" ہونا ثابت کر دیا تو کہدیا کہ ہمارا استنباط ان کی سند کو منسوخ کرتا ہے۔

یہ ہے مقام امیر جماعت اسلامی کا! سبحان اللہ ما اعظم شانہٗ!

(باقی مضمون صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ کیجئے)

باب المراسلات

مہاجرین کا مسئلہ

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں مہاجرین کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا اس کے متعلق ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر اہمیت رکھتا ہے اس سے کسی حساس قلب کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی دکھائی دیتا ہے آپ نے اس ضمن میں مشورہ دیا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں بسنا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ان قومی رہنماؤں کو ہندوستان واپس بھیجا جائے جو وہاں کے مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان آ بیٹھے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان با اثر لوگوں کے وہاں چلے جانے سے وہاں کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھ جائے گی لیکن یہ توقع کرنا کہ یہ لوگ یہاں کی آسائشیں چھوڑ کر وہاں کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کیلئے ہندوستان واپس چلے جائیں گے، ایک خیالِ خام ہے۔ اگر انہیں اپنی ذمہ داریوں کا ایسا ہی احساس ہوتا تو یہ ہندوستان چھوڑتے ہی کیوں۔ اسلئے یہ علاج ناقابلِ عمل رہے گا۔

(۲) دوسرا علاج آپ نے یہ بتایا ہے کہ اگر یہاں کے قائدین وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوں تو پھر وہاں کے مسلمانوں پر پاکستان کے دروازے بند کئے جائیں تاکہ وہ اور سب کچھ نہ سہی کم از کم اپنی جان اور آبرو کی حفاظت تو کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں بے کسی اور بے چارگی کے عالم میں چھوڑ دینا ان پر انتہائی ظلم ہے لیکن پاکستان میں اتنی سکت کہاں ہے کہ وہ اس قدر کثیر التعداد آبادی کو اپنے ہاں آباد کرے گا۔ اس لئے یہ طریقِ علاج بھی ناقابلِ عمل دکھائی دیتا ہے۔

اندریں حالات ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کیا جائے اور اس کے بعد اس مشکل کا کوئی ایسا حل تجویز کیا جائے جو مؤثر بھی ہو اور قابلِ عمل بھی۔

طلوعِ اسلام ہم نے مہاجرین کے مسئلہ کے متعلق ماہ جون کی اشاعت میں جو کچھ لکھا تھا وہ درحقیقت صورت حالات کا منطقی تجزیہ تھا اس معاہدہ کی روشنی میں جو اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان طے پایا ہے۔ ورنہ جہاں تک ہمارا ذاتی خیال ہے اُسے ہم اس سے پہلے کئی بار دہرا چکے ہیں اور اب بھی اسی

خیال پر قائم ہیں کہ اگر ہمیں فی الواقعہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا کوئی حل تلاش کرنا ہے تو وہ اول و آخر تبادلۂ آبادی کی صورت ہی میں ہو سکے گا۔ اس کے سوائے کوئی دوسری صورت اس مشکل کا حل پیش نہ کر سکے گی۔ ہم اشیاء کا مسئلہ کاغذی معاہدوں سے حل کر سکتے ہیں لیکن انسانوں کا معاملہ قلمی معاہدوں کے بغیر نہ کبھی طے پایا ہے اور نہ طے پائے گا۔ قلوب کی تعمیر کسی قوم کے فلسفۂ زندگی سے تشکیل ہوتی ہے۔ ہندو قوم کا فلسفۂ زندگی ہمارے سامنے ہے وہ اپنے ہاں کے چار ورنوں کے باہر کسی کو انسان ہی تسلیم نہیں کرتی، حتیٰ کہ خود ان کے ورنوں میں سے بھی کم از کم ایک ورن کے اندر انسانیت کی ذلت اور نفرت کے تمام امکانی تصورات جمع ہیں۔ اونچے ورن کا ہندو ان کے چھونے ہی سے نہیں بلکہ ان کے سایہ تک سے بھی بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اس تعلیم کی روشنی میں غیر ہندو سے نفرت اور لہٰذا عداوت ایک کھلا ہوا منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کے خلاف ہی وہ جذبۂ نفرت تھا جسے انھوں نے تاریخی افسانوں سے ہوا دی اور ہر ہندو کے دل میں علیٰ قدرِ حوصلہ انتقام کی آگ بھڑکا دی گئی۔ اسی آگ کے شعلوں کی لپٹ ہے جس سے بھارت ورت کی چار دیواری میں مسلمانوں کے لئے زندگی جہنم بن رہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے اربابِ حکومت سیاسی مصالح کے پیشِ نظر مسلمانوں کے تحفظ کا یقین دلاتے رہیں اور اس کی توثیق معاہدات سے بھی کر دیں لیکن وہاں کے مسلمانوں کو ان اربابِ حکومت کی کوٹھیوں میں زندگی بسر نہیں کرنی۔ انھیں وہاں کی ہندو جاتی میں دن گذارنے ہیں۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ وہاں کے اربابِ حکومت ہر مسلمان کے ساتھ ایک ایک باڈی گارڈ متعین کر دیں گے جو اُن کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرتا رہے گا۔ اور اگر غور سے دیکھئے تو باڈی گارڈ بھی کسی کی کہاں تک حفاظت کر سکتے ہیں۔ حکومت کے انتظامات جاتی کے ہاتھوں مہاتما گاندھی جیسی شخصیت کی بھی حفاظت نہ کر سکے تو کیا وہ انتظامات وہاں کے چار کروڑ مسلمانوں کی فی الواقعہ حفاظت کر سکیں گے؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

ہندوؤں کا پروگرام بالکل واضح ہے اور جن لوگوں نے تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے مہاتما گاندھی کی ان تقریروں کو غور سے سنا تھا جو وہ دہلی سے نشر کیا کرتے تھے وہ اس کی تائید کریں گے کہ ہندوؤں کے پیشِ نظر شروع ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان جو بالعموم تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنے جداگانہ قومی تشخص (یعنی مسلمان ہونے) کا عقیدہ محکم طور پر رکھتے تھے انھیں یا تو تبلیغ کر دیا جائے یا پاکستان جانے پر مجبور۔ باقی رہے دیہاتی مسلمان سو وہ ایک آدھ نسل کے بعد خود بخود ہندوؤں میں جذب ہو جائیں گے۔

ان حالات کے ماتحت یہ سمجھنا کہ ہندوستان کا مسلمان وہاں بحیثیت مسلمان زندہ اور باقی رہ سکے گا خود فریبی سے کم نہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ کا حل تبادلۂ آبادی کے سوائے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اگر تقسیم ہند معتدل حالات کے ماتحت وجود میں آتی تو اس مسئلہ کا حل اسی وقت کیا جا سکتا تھا۔ اُس صورت میں ملک کی تقسیم کا معیار اس وقت کی اکثریت کے علاقے قرار نہ پاتے بلکہ اس کی جگہ ہوتا یہ کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے

غیر مسلموں اور ہندو اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں سے کہدیا جاتا کہ جس کا جی چاہے وہ ایک معینہ مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اپنی اکثریت کے علاقوں کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ انتقالِ مکانی کے ساتھ ان کے املاک اور اموال کے تحفظ کی ضمانت بھی دی جاتی۔ یہ انتقالِ آبادی انگریزی حکومت کے زیرِ انتظام طے پاتا۔ جب اس طرح آبادیاں منتقل ہو جاتیں تو آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ملک کے رقبہ کی تقسیم کی جاتی اور یہ تقسیمی خطوط پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے حدود قرار پاتے۔ لیکن بدقسمتی سے حالات ایسے پیدا ہو گئے یا کر دیئے گئے جن کے ماتحت ایسا نہ ہو سکا اور جو ابھی کل شام تک اپنے مکانوں اور دکانوں پر پاکستانی جھنڈا لہرا رہے تھے دوسری صبح انھوں نے دیکھا کہ ریڈکلف کی ابرو کے ایک اشارہ نے انھیں بھارت ورش کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا حل اب بھی یہی ہے کہ جو کچھ اُس وقت نہ ہو سکا اُسے اب کر لیا جائے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان معاہدہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کی حدودِ مملکت میں بسنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہہ دیا جائے کہ جس کا جی چاہے اپنی اکثریت کے علاقوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس تبادلہ آبادی کی ذمہ داری متعلقہ حکومت اپنے سر لے اور منتقل ہونے والے باشندوں کی جائدادوں کے انتقال کی ضمانت بھی دے۔ یہ سب کچھ ایک مدتِ معینہ کے اندر مکمل ہو جانا چاہئے اس کے بعد آبادی کے تناسب سے ملک کے رقبہ میں مناسب ترمیم کرنی چاہئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اس تبادلہ آبادی میں بہت سی انتظامی دشواریاں پیش آئیں گی لیکن وہ دشواریاں بہرکیف اور بہرحیثیت ان مستقل مشکلات اور مسلسل بدامنی سے کہیں کم ہوں گی جو غیر مطمئن رعایا کو مجبوراً اپنے ہاں رکھنے سے دونوں مملکتوں کو پیش آتی رہیں گی۔ اس تین برس کے عرصہ کو دیکھئے فکری تدبیروں اور انتظامی کارکردگیوں کا بیشتر حصہ اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلہ کی نذر ہو گیا اور اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ کوئی اطمینان بخش صورت پیدا نہ ہو سکی بلکہ حالات اس درجہ نازک ہو کر رہ گئے کہ اگر بعض موانع حائل نہ ہو جاتے تو ان دونوں مملکتوں میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی۔ جو کچھ اس تین سال کے عرصہ میں ہوا ہے وہی کچھ مستقل طور پر ہوتا رہے گا۔ ہندو جاتی اپنی اس ذہنیت کے ماتحت جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے مسلمان کو دہری مار مارتی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں پر بے حد مظالم ہو رہے ہیں اور اس طرح پاکستان کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر دیتے ہیں جس سے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان کی طرف بھاگ آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انھیں خود تو اس طرح بھاگنے پر مجبور کیا جاتا ہے مگر ان کے چلے آنے کے بعد شور یہ مچایا جاتا ہے کہ پاکستان بھارت میں بدامنی پھیلانے کے لئے یہاں کی مطمئن رعایا کو اکسا اکسا کر اپنے ہاں بلا رہا ہے۔ ابھی پچھلے معاہدہ کو دیکھئے، پاکستان میں ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کیا جو انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ کیا۔

لیکن معاہدہ کی تمہید میں انھوں نے پاکستان کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو برابر کا ملزم تسلیم کرے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے پراپیگنڈے کے اثر سے بین الاقوامی ادارے پاکستان کو کچھ زیادہ ہی ملزم سمجھتے ہیں۔ کہئے کہ ان حالات میں کس طرح امن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے! ہمارے خیال میں دونوں مملکتوں میں خوش گوار تعلقات کے قائم کرنے کی اطمینان بخش صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ باہمی رضامندی اور مفاہمت سے تبادلہ آبادی کو ممکن بنا دیں اور اس طرح ہمیشہ کے لئے ان خاردار جھاڑیوں سے نجات پا لیں۔ یہ کچھ اول و آخر زود یا بدیر کرنا ہی ہوگا۔ جتنی جلدی یہ کر لیا جائے اتنا ہی یہ دونوں مملکتوں کے حق میں نفع بخش ہوگا۔ جتنی دیر کی جائے گی دشواریاں بڑھتی جائیں گی۔ کچھ عرصہ پیشتر ترکوں اور یونانیوں کی ملحقہ مملکتوں کو بھی اسی قسم کی دشواری پیش آئی تھی۔ انھوں نے سیاسی عاقبت اندیشی سے کام لیا اور باہمی سمجھوتے سے متعلقہ حکومتوں کے زیر اہتمام تبادلہ آبادی کے مراحل طے کر لئے اور اس کے بعد دونوں مملکتیں امن اور چین سے رہنے لگیں۔ اگر یہ کچھ وہاں ہو سکتا تھا تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔

ہماری پیش کردہ تجویز کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن العمل ہو سکتی ہے جب اس پر ہندو بھی رضامند ہو لیکن اگر ہندو اس پر رضامند نہ ہو تو؟ یہ صورت واقعی درخور اعتنا ہے بالخصوص اس لئے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ پاکستان کا مسلمان اپنی ہندو اقلیت کی حفاظت بہر حال کرے گا اس لئے کہ اس کا فلسفہ زندگی اسے ظلم اور ناانصافی کی کبھی اجازت نہیں دیگا۔ لہٰذا سوال کی نوعیت یوں ٹھہری کہ اگر ہندو تبادلہ آبادی پر رضامند نہ ہو تو کیا ہندوستان کے مسلمانوں پر پاکستان کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور اس طرح انھیں بے کسی اور بے بسی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ یا تو ذلت کی زندگی جئیں اور یا بے چارگی کی موت مریں۔ خالص سیاسی اعتبار سے اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ سیاسی اعتبار سے وہاں کا مسلمان بھات کی رعایا ہے اور اسے اپنے معاملات اپنی حکومت سے خود سلجھانے چاہئیں۔ ہم اپنے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کی حفاظت اور بہبود کے ذمہ دار ہیں۔ دوسرے ملک میں بسنے والے مسلمانوں سے سوائے لفظی ہمدردی کے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ سیاسی نقطۂ خیال سے یہ جواب نہایت مدلل اور یہ طرز عمل بالکل مناسب ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک مسلمان (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والے انسان) کے نزدیک بھی یہ جواب معقول اور یہ اسلوب فکر مناسب قرار پائے گا؟ جیسا کہ ہم اپنی آزادی کی دس سالہ جدوجہد میں اعلان کر چکے ہیں (اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے دعوئے آزادی کی بنیاد ہی اس مسلہ پر تھی) کہ مسلمان کی قومیت کا مدار کسی ملک کی حدود و ثغور نہیں ہوتیں بلکہ اس کی قومیت وحدتِ فکر و عمل سے تربیت پاتی ہے جس کا نام دین کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ ہم نے اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے کو انگریز اور ہندو دونوں سے اسی بنیادی حقیقت کی بنا پر منوایا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم تھی، مسلّم ہے اور مسلّم رہے گی کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدار ایمان کے سوا اور کسی شرط پر نہیں۔ بنا بریں ہندوستان اور

پاکستان کے درمیان ملکی تقسیم کا خط ادھر کے مسلمانوں کو ہم سے ایک الگ قوم نہیں بنا سکتا۔ اگر ہم میں سے کوئی اس تقسیمی خط کو جداگانہ قومیت کا معیار قرار دیتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے بنیادی تقاضے سے علی الاعلان انکار کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ دنیا کو یہ بھی بتاتا ہے کہ ہماری جنگِ آزادی میں جداگانہ قومیت کا تقاضا محض ایک وکیلانہ حربہ تھا یا سیاسی چال۔ خدا پناہ میں رکھے ایسے شخص سے جو قرآنی حقیقت کا اس طرح انکار کرے اور پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کو ایسا منافق ثابت کرے۔ لہٰذا اس حقیقتِ کبریٰ میں کسی شبہ یا اویل کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ایک ہی ملت کے افراد اور ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ اس لئے اگر ہندو تبادلہ آبادی پر رضامند نہ بھی ہو تو بھی ہم کسی صورت میں بھی ہندوستانی مسلمانوں پر اپنا دروازہ بند نہیں کر سکتے۔ ہماری سیاست کا مرکز حریم کعبہ ہے جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ سواء العاکف فیہ والباد ہے یعنی اس کے دروازے وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ہم جس نام پر بھی اسلامی حکومت کے قیام کا ارادہ کریں گے کعبہ کا سیاسی قانون ہمارے آئین و دستور کی بنیاد ہوگا۔ اس لئے اگر کعبہ کا دروازہ ملکی اور غیر ملکی مسلمانوں میں تمیز نہیں رکھتا اور ہر ایک کے لئے کھلا کھلا اعلان کرتا ہے کہ ومن دخلہ کان اٰمنا۔ یعنی جو بھی اس گھر میں داخل ہو گیا وہ ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو گیا تو وہ کونسا مسلمان ہے جو قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ پاکستان کا دروازہ ہندوستان کے مسلمانوں پر بند ہے؟ ہماری سیاسی مصلحت کوشیوں کے تقاضے کچھ بھی ہوں لیکن دین کا تقاضا ان سب پر غالب رہے گا۔ اور اگر ہمارے لئے قولِ فیصل دینی تقاضا نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کوشیاں اور ہنگامی مفاد انگیزیاں ہی ہیں تو پھر ہمیں ان اعلانات سے فوراً دست بردار ہو جانا چاہئے کہ پاکستان اسلامی دستورِ زندگی کی تشکیل کے لئے وجود میں لایا گیا ہے۔ کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔

بنا بریں یہ خیال ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے دل میں نہیں آنا چاہئے کہ جو مسلمان اس وقت پاکستان میں ہیں پاکستان انہی کا گھر ہے اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ہیں وہ غیر ہیں، ان کا اس گھر میں کوئی حصہ نہیں۔ پاکستان وہ مسجد ہے جس میں ہر مسلمان کا برابر کا حصہ ہے۔ اور قرآن کے فیصلہ کے مطابق "اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جو لوگوں کو اللہ کی مساجد میں آنے سے روکے" اس لئے پاکستان کے دروازے ہندوستان کے مسلمانوں پر کسی صورت میں بھی بند نہیں کئے جا سکتے۔ ولو کرہ المشرکون۔ لہٰذا ..... ہمیں ان مسائل کے دوسرے حل تلاش کرنے ہوں گے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے پاکستان میں آجانے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ درد سر کا علاج سر کو کاٹ کر الگ پھینک دینے سے نہیں ہوا کرتا۔ جو طبیب اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں جانتا وہ جتنی جلدی اپنے دعویٰ طبابت سے دست کش ہو جائے اتنا ہی نوعِ انسانی کے لئے مفید ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس اتنی کثیر آبادی کے لئے گنجائش کہاں ہے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر دس برس میں پاکستان کے

موجودہ مسلمانوں کی اپنی آبادی ہی سوائی یا ڈیوڑھی ہو جائے تو کیا آپ آبادی کے اس اضافہ کو بحیرۂ عرب میں ڈبو دیں گے؟ اس وقت بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ جو کچھ اس وقت کیا جائے گا اسے آج ہی کر لیجئے۔ حکومت کرنے والی قوموں کے تدبر کی آزمائش ایسے ہی مسائل کے حل سے ہوا کرتی ہے۔

ممکن ہے یہ بھی کہا جائے کہ سوال جگہ کا نہیں معاشی مشکلات کا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کہ پاکستان کے معاشی ذرائع اتنی آبادی کے لئے کفیل ہو سکتے ہیں یا نہیں صحیح اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو ہمارے ہاں موجود نہیں۔ لیکن ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ جو کچھ ہمیں ملا ہے اس کی تقسیم اگر مساویانہ حیثیت سے کر دی جائے تو یہی ذرائع کم از کم چار گنا زیادہ آبادی کی ضروریات زندگی کے لئے بآسانی مکتفی ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا صحیح طریق یہ ہے کہ ان ذرائع پیداوار (زمین۔ کارخانے۔ معدنی ذخائر وغیرہ) کو افراد کی ملکیتیں قرار دینے کی بجائے ملت کی مشترکہ ملکیت قرار دیا جائے جن کے ماحصل میں ہر فرد ملت کا برابر کا حصہ ہو۔ جس غریب گھر میں چار روٹیاں پکتی ہیں اس کے آٹھ افراد خاندان آپس میں آدھی آدھی روٹی بانٹ لیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک شخص پیٹ بھر کر کھالے اور باقی سات بھوکے سو رہیں۔ اس وقت ہم پر ایسا ہی وقت آپڑا ہے اور اس مشکل کا حل بھی یہی ہے۔ اس وقت سارے پاکستان میں تمام ذرائع پیداوار چند گنتی کے خاندانوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہی ہیں جو یہاں کے غریبوں کو اس سطح پر آنے نہیں دینا چاہتے ہیں اور یہی ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی وہیں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ان تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیدیا جائے تو ان سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے موجودہ مسلمانوں ہی کی اقتصادی سطح بلند ہو جائے گی بلکہ یہ بھی کہ ہم ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو یہاں جوں توں بسا سکتے ہیں۔ ہماری مشکل معاشی کمزوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ مترفین کا گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا ہے اور خدا کی ربوبیت کو عام نہیں ہونے دیتا۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر اربابِ حکومت کے دل میں اس مسئلہ کے حل کی تلاش کا جذبۂ صادق ہے تو اس کے لئے صرف عزمِ راسخ کی ضرورت ہے باقی سب کچھ یہاں موجود ہے۔ ولما فتحوا متاعھم وجدوا بضاعتھم ردت الیھم۔ ہمارا سامانِ زیست خود ہماری اپنی بوریوں میں بند ہے۔ بس سوال ان بوریوں کے منہ کھول دینے کا ہے۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں گذارش کی گئی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) اقلیتوں کے مسئلہ کا اطمینان بخش اور موثر حل پاکستان اور بھارت دونوں مملکتوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔

(۲) ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا مستقل، موثر اور قابلِ اطمینان حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اقلیتوں کو اپنی اکثریت کے علاقہ میں کسی مدتِ معینہ کے اندر چلے جانے کی کھلی اجازت دیدی جائے اور جس ملک میں فاضل آبادی انتقالِ مکانی کرے

اسے مزید علاقہ دیدیا جائے۔ جتنی جلدی اس حل کو اختیار کیا جائے گا اتنا ہی ہر دو مملکتوں کیلئے مفید ہوگا۔

(۳) ان حالات کے پیش نظر حکومتِ پاکستان اور حکومتِ ہندوستان کے مابین اقلیتوں کے تبادلہ اور اس کے تضمنات کے متعلق گفت و شنید شروع کر دینی چاہیئے۔

(۴) جب تک یہ امور عملی طور پر طے نہ پا جائیں اتنے عرصہ کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان وہاں امن سے دن بسر کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انھیں وہاں بے یار و مددگار نہ چھوڑا جائے بلکہ ان سربرآوردگانِ قوم کو جو انھیں تنہا چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں واپس بھیج دیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت ہندوستان کی واپسی میں مزاحم نہ ہوگی۔

(۵) اگر یہ سربرآوردگان قوم واپس جانے پر تیار نہ ہوں یا ان کی مراجعت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کو اطمینان نصیب نہ ہو تو آخری حل کے مذاکرات کے دوران میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ صرف پاکستان آنے کی اجازت ہونی چاہیئے بلکہ اس باب میں ضروری سہولتیں بھی بہم پہنچانی چاہئیں۔

(۶) ان تدابیر کے ساتھ ہی خود پاکستان میں مسلمانوں کی موجودہ آبادی اور ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کو امن اور خوشحالی سے بسانے کے مختلف طریقوں پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ معاشی ہے جس کا حل یہ ہے کہ پاکستان کے تمام ذرائع پیداوار کو انفرادی ہاتھوں سے نکال کر قومی ملکیت قرار دیدیا جائے اور اس طرح ان ذرائع کے ماحصل کی تقسیم تمام باشندگانِ پاکستان کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق کی جائے کہ۔ یہی ہے استوں کے مرضِ کہن کا چارہ۔ یہی ہے وہ اسلامی سوشل ازم جس کے متعلق ہمارے وزیراعظم امریکہ میں بار بار اعلان فرما چکے ہیں۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

آپ کے شہر میں
طلوعِ اسلام کی ایجنسی نہیں ہے
تو اب قائم کیجئے
شرائط ایجنسی اور نمونہ کا پرچہ ادارہ سے طلب کیجئے۔

عہدِ حاضر کے مسائل — اور ان کا حل

(جناب نذر الباقر صاحب ڈپٹی سکرٹری وزارت اطلاعات پاکستان)

نذر الباقر صاحب کا ایک — پہلا — مضمون سابقہ اشاعت میں قارئین کی نظر سے گذر چکا ہے۔ آپ بزمِ طلوعِ اسلام میں نو وارد ہیں لیکن اجنبی نہیں، کیونکہ آپ بھی قرآن کے ایک طالب علم ہیں اور عقیدۃً نہیں بلکہ علیٰ وجہ البصیرت قرآن کو انسانیت کے عروج و ارتقاء کا واحد ضابطہ سمجھتے ہیں۔ اب تک آپ نے اپنے نتائجِ فکر و نظر کو انگریزی زبان میں ہی پیش کیا ہے اور یہ دونوں مضامین بھی درحقیقت انگریزی ہی کے ترجمے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ آئندہ اردو کے حقوق کا بھی خیال رکھیں گے اور طلوعِ اسلام کو اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنائیں گے۔ طلوعِ اسلام کے صفحات ہر اس کے لئے کھلے ہیں جو سنجیدگی اور ذمہ داری سے ملی مسائل کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا اور حل کرنا چاہتا ہے۔

ہمارا زمانہ ایٹمی زمانہ ہے جس میں گرد و پیش کی ہر شے اس غیر معمولی اور حیرت انگیز سرعت سے حرکت پذیر ہے کہ ایک عام سطحِ شعور والے انسان کے حواس گم ہو جاتے ہیں اور وہ ورطۂ حیرت میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ دنیا مدہوش ہے اور محیر العقول اور مرعوب کن سائنسی ایجادات کے نشہ میں اندھا دھند، خنداں و نازاں بھاگے چلی جا رہی ہے۔ وہ دیوانہ وار بھاگے جا رہی ہے اور نہیں جانتی کہ ہلاکت اور تباہی کے کس غار کی سمت جا رہی ہے۔ اس ذہنی اور جسمانی بھگدڑ میں اتنا سکون اور مہلت کیسے میسر آئے کہ اس پاگل پن کے نتائج و عواقب کو بھانپا جا سکے اور دیوانوں کے رقصِ ہلاکت کے انجام کا لحاظ کیا جا سکے۔

مادرِ گیتی کے زرخیز البطن سے ہر لحظہ نئی دخترانِ مشکلات متولد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مشکل کا حل ابھی سوچا ہی نہیں گیا ہوتا کہ دوسری مشکل نمودار ہو جاتی ہے۔ ہر نئی مشکل نتیجہ ہوتی ہے اس حل کا جو بزعمِ خود ہم پہلی مشکل کے لئے سوچتے اور بروئے کار لاتے ہیں۔ گردابِ حیات اپنی تہ سے نت نئے حوادث اچھالتا ہے اور ہماری مشکلات اور مسائل کو اس قدر بغایت پیچیدہ بناتا جا رہا ہے کہ ہماری عقل ان کے حل سے عاجز آتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہم ان مشکلات کے دھارے پر خسِ ناتواں کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ صورتِ حال مایوس کن ہے لیکن اس کا یہی پہلو فکرِ انسانی کیلئے مہمیز کا کام دے کر، حل کا تقاضا کرتا ہے۔ میں آج کی صحبت میں اپنی بصیرت کے مطابق اس تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

آج ساری دنیا طوعاً و کرہاً تہذیبِ مغرب کی علمبردار ہے اور انسان کو وہی قوتیں ہانکے لئے جا رہی ہیں جو ضمیرِ مغرب میں وجود پذیر ہو کر ابھرتی ہیں اور جنھوں نے انسان کو مادہ کا غلام بنا دیا ہے۔ اشتراکی دنیا جو سرمایہ دارانہ نظامِ مغرب کے خلاف شدید ردِ عمل کی شرمندۂ تخلیق ہے، وہ بھی اساسی طور پر مادیت ہی کی بنیادوں پر استوار و قائم ہے۔ مشرق مردہ، جاہلانہ اور رجعت پسندانہ روایات پسندی اور ترک کے باطل تصورات کی افیونی غفلت سے کہ جس میں وہ صدیوں سے ڈوبا چلا آ رہا تھا بیدار ہونا شروع ہوا ہے۔ اس نیم خوابی یا نیم بیداری کی حالت میں، ہر چند مشرق ایک حد تک تہذیبِ مغرب پر ناک بھوں چڑھاتا نظر آتا ہے، تاہم قریباً بطیب خاطر ہی وہ اپنی آسودگی کی تلاش میں آغوشِ مغرب میں پہنچ چکا ہے اور امامِ مغرب کا متقدی و مطیع ہو چکا ہے۔

میرے ان الفاظ سے شاید یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ میں بھی عام اندازِ گفتگو کے مطابق طبیعاتی سائنس کی ترقیات کو بنظرِ حقارت دیکھتا ہوں یا تسخیرِ مادہ نے ہماری آسائشوں میں جو چند در چند اضافہ کر دیا ہے ان کا استخفاف کرتا ہوں۔ میں اس پامال راہ پر گامزن نہیں۔ میں ابھی وضاحت سے بیان کروں گا کہ میرے نزدیک محلِ نظر یہ مادی ترقیاں نہیں بلکہ روابطِ انسانی کا وہ تصور ہے جو مادی ترقی کے اس جنون نے پیدا کر دیا ہے۔

میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ دنیا کی امامت اس وقت تہذیبِ مغرب کے سپرد ہے جس کی اساس مادیت پر ہے۔ ہم خواہ اس امامت کا اعتراف کریں، خواہ نہ کریں، یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ ایک مشرقی خوابِ غفلت سے بیدار ہوتے ہی جب اپنے گرد و پیش بیداری و حرکت کے انوکھے مظاہرے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ جسمانی اطواق و سلاسل سے خلاصی پا چکا ہوتا ہے، وہ قدرتی طور پر بوکھلا سا جاتا ہے۔ اس کی پریشانی قابلِ فہم ہے۔ اس عالم میں رہنمائے عالم تہذیبِ مغرب پر ایسے مشرقی کی تنقید کو چنداں شائستہ اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ لہذا میں مغربی مشاہیر مفکرین کے آراء و افکار ہی کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

Rene Guenon (فرانسیسی مفکر) اپنی تازہ ترین کتاب (The Crisis of the Modern World) میں لکھتا ہے،

> تہذیبِ جدید بتدریج نیچے گرتی گئی ہے، حتی کہ یہ انسانی جذبات کے درکِ اسفل تک پہنچ چکی ہے اور اس کا مقصد فطرتِ انسانی کے صرف مادی پہلو کے تقاضوں ہی کی تسکین تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ مقصد بہر حال ایک فریب ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ اتنی مصنوعی ضروریات پیدا کر دیتا ہے کہ ان کی تسکین اس کے بس کا روگ نہیں رہتی۔ عہدِ حاضر کا آئیڈیل "انسانی حیوان" ہے جو جسمانی قوت میں بدرجہ غایت ترقی کر چکا ہے۔ اس کے ہیرو "زور آزما" ہیں، عام اس سے کہ وہ وحشی ہی کیوں نہ ہوں۔ یہاں قوانینِ مادہ ہی کا دور دورہ ہے اور یہ قوانین ہر اس کو بلا استثناء اور بالیقین ہلاک کر دیتے ہیں۔

جو خود مادہ سے بالاتر نہیں ہوتا لیکن ان قوانین پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ مادہ کی اندھی اور وحشی قوتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں وہ انہی قوتوں کے ہاتھوں، جن پر انہیں کچھ قدرت نہیں رہتی، بس کر فنا ہو جائیں گے۔ ان کو ایک دفعہ بے خودی سے حرکت آشنا کر دیجئے، ان کی ہلاکت آفریں رفتار کی تا دیر روک تھام ناممکن ہو جائے گی۔ مغرب کو ہلاکت کا خطرہ درپیش ہے۔ وہ خود تو ڈوبے گا ہی، لیکن ڈوبتے ڈوبتے ساری انسانیت کو اسی گرداب ہلاکت میں غرق کر دے گا۔

Lord Snell اپنی مشہور کتاب The New World (مطبوعہ ۱۹۴۹) میں لکھتا ہے:

تاریخ انسانیت میں اس سے زیادہ تقدیر ساز اور فیصلہ کن انتخاب کا موقعہ پہلے کبھی نہیں آیا۔ تہذیب تقدیر کے دوراہے پر کھڑی ہے اور ایک غلط قدم بھی اسے خطرہ میں ڈال سکتا ہے، بلکہ ہلاک کر دینے کا موجب بن سکتا ہے۔ انسان کی طویل مدت حیات میں اس سے پیشتر کئی مرتبہ نازک اور کٹھن مرحلے آئے ہیں، لیکن موجودہ مرحلہ نہ محض حدود کے اعتبار سے کہیں زیادہ وسیع اور نتائج کے لحاظ سے کہیں زیادہ دور رس ہے، بلکہ زیادہ حوصلہ شکن، پریشان کن اور پیچیدہ ہے۔ ماضی کے نازک مراحل معین علاقوں تک محدود ہوا کرتے تھے اور مخصوص اور مناسب مسائل کو محیط ہوا کرتے تھے۔ جنگیں معین مقاصد کے لئے لڑی جاتی تھیں، منڈیوں کے لئے، خام پیداوار کیلئے، اہم مفادات کیلئے۔ وہ جنگیں خاندانی اور مادی اغراض و مفادات کیلئے لڑی جایا کرتی تھیں۔ اس کے برعکس موجودہ جنگوں کی وجوہات روح انسانی کی کہیں گہری تہوں تک پہنچ گئی ہیں، نسلی تفاخر، برگزیدہ قومیت کا خود ساختہ تصور اور اس کی ہوس استیلاء اور باطل فلسفہ ریاست۔ انسانیت اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے ہوئے حربوں کے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ یہ مشینی ایجادات کو معرض وجود میں تو لے آئی ہے لیکن ان پر اسے قدرت حاصل نہیں ہو سکی۔

Aldous Huxley اپنی کتاب Science, Liberty and Peace (مطبوعہ ۱۹۴۶ء) میں لکھتا ہے:

کوئی ایسی مثال دیکھنے میں نہیں آسکی کہ ضرورت سے زیادہ قوت اصحاب قوت کیلئے وجہ فساد نہ بنی ہو۔ نہ اب ایسا باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ اس ضمن میں آئندہ انسانوں کا طرز عمل کسی لحاظ سے ان کے ماضی کے یا موجودہ طرز عمل سے مختلف ہوگا۔

یہ اقتباسات یقینی چیخیں ہیں اور ناقابل تردید ثبوت ہیں اس حقیقت کا کہ یہ تہذیب یکسر ناکام ہو چکی ہے۔ یہ اعتراف ناکامی خود انہی کے مشاہیر کا ہے جن کے ہاتھوں میں دنیا اور انسانیت کی امامت کی باگ ڈور ہے۔

جہاں تک اشتراکی تجربہ کا تعلق ہے، بیرونی دنیا بہت حد تک آہنی پردہ کے پیچھے کے کوائف و حالات سے بے خبر ہے۔

بہرحال یہ تجزیہ ابھی بنا ہے اور اس کے نتائج کو مرتب ہونے کے لئے ایک عرصہ چاہئے۔ تاریخی اسباب و علل کے اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایک ایسے تجربے کے نتیجہ سے متعلق کسی حسنِ ظن کی توقع بہت کم ہے جو محض اسی اصول پر استوار ہو۔ اس فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ کم درجہ کے لوگوں کے لئے ایک مساویانہ قسم کا معیارِ زیست حاصل کیا جائے جو ان کی ابتدائی ضروریات کی تسکین کا ضامن ہو۔ یہ ابتدائی ضروریات کیا ہیں، خوراک، لباس، رہائش۔ اور بس۔ شکم پر کرانے، تن ڈھانپ دینے اور آشیاں سازی کے بعد اس نظام کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا۔ اس کے پاس کوئی بلند اقدار نہیں۔ نظری طور پر یہ فلسفہ حیوانی سطح تک انسانوں میں مساوات پیدا کرنے کا داعی ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اور پھر یہ کہ یہ مساوات حاصل ہی کیوں کی جائے؟ مارکسی فلسفہ ان اساسی سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ یہ مذہب (یہ مذہب نہیں تو اور ہے کیا!) بظاہر جامد مقاصد کا حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کے بعد اس کی ترقی رک جائے گی، الا یہ کہ اس کی آستین میں کوئی ایسے مقاصد مخفی ہوں جو اس وقت عیاں نہیں۔ اس حرکیاتی کائنات میں ہر سکون پذیر شے ہلاک و تباہ ہو جائے گی۔ علمِ تاریخ کا تو یہی قطعی فیصلہ ہے۔

موجودہ صدی میں جو بمشکل آدھی گزری ہے، تاریخ انسانی کی دو انتہائی خوفناک جنگیں وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ ان کے درمیانی زمانے میں امن مفقود ہی رہا ہے۔ دوسری جنگ کے شعلے بمشکل سرد ہوئے تھے کہ تیسری جنگ کے خوفناک بادل گھرنا شروع ہو گئے ہیں۔ انسانیت کے پرانے زخم ابھی مندمل نہیں ہو پائے کہ وہ ایک نئی ناقابلِ بیان تباہی کے تصور سے ہی کانپ رہی ہے۔

سطورِ بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انسانیت ایک خطرناک مرض کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کا مرض اس قدر شدید ہو چکا ہے کہ وہ اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتی اور از روئے فرار خودکشی کی مرتکب ہوتی نظر آتی ہے۔ اس شدید نفسیاتی مرض کا فی الفور ماہرانہ تجزیہ ہونا چاہئے تاکہ مرض کا حقیقی سبب اور اس سے پیدا شدہ نتائج دریافت ہو سکیں۔

بہ نظرِ غائر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علتِ مرض درحقیقت نفسیات کی اصطلاح میں احساسِ خوف (Fear Complex) ہے جو مذہبی اصطلاح میں "شیطان" اور "ابلیس" کا مترادف ہے۔ انسان انسان سے بے حد ترساں ہے، دوسرے انسان سے ہی نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ سے اپنی دستکاری سے ترساں ہے۔ یہ احساساتِ خوف اس عفریت کے شرمندۂ تخلیق ہیں جسے انفرادیت Individualism کہا جاتا ہے اور جس کا نکتۂ آخری دیو ہزار سر یعنی وطنیت Nationalism ہے۔

ان باطل خداؤں نے ہم میں یہ بنیادی طور پر باطل تصور پیدا کر دیا ہے کہ ہم اندھی فطرت کی طبیعی و حیاتیاتی قوتوں کا اتفاقی ماحصل ہیں۔ اس کے مطابق افرادِ انسانی پیدا ہو کر افراد کی شکل میں ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں اور کٹ کر ہی رہتے ہیں اور ان کا باہمی رابطہ صرف حیوانی سطح کے طبیعی تقاضوں یعنی خوراک، لباس، رہائش تک محدود رہتا ہے۔ ہر فرد طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور معین میعاد کے بعد اس کا شیرازۂ ہستی منتشر ہو جاتا ہے۔ جب وہ زندہ ہوتا ہے تو تحفظِ ذات کا

نام نہاد جبلی تقاضا اسے ریوڑ کی شکل میں رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کی دنیا میں ایک ہی قانونِ جنگل کی فرماں فرمائی ہے جسے قانون بقائے اصلح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسان دیگر حیوانات کی طرح محض ڈر کی وجہ سے حفاظت کے خیال سے گروہوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ خارجی قویٰ افراد کو اکٹھا کر دیتے ہیں اور اس طرح قبیلے بنتے ہیں، قومیں معرضِ وجود میں آتی ہیں اور بین الاقوامی گروہ بندی ہوتی ہے۔ یہ گروہ بندی صرف اسی حد تک قائم رہتی ہے جہاں تک کہ مصنوعی خارجی قویٰ اسے قائم رکھ سکتے ہیں مدد رہتے ہیں۔ بیرونی اثر یا خطرہ دور ہوتے ہی یہ جمعیت ختم ہو جاتی ہے۔ داخلی دنیا میں افراد اور اقوام باہمی طور پر ہر قسم کی قدرِ مشترک سے محروم ہیں۔

اس انفرادیت و انانیت کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جو فرد یا جو قوم اس قدر طاقت کی مالک ہے کہ وہ اپنی بے لگام خواہشات کی تکمیل کے لئے بے خوفی سے دوسرے فرد یا قوم کا گلا کاٹ سکے تو اسے نہایت آسانی سے ایسا کر لینے کا کافی جواز مل جاتا ہے۔ آزادی بدلگامی میں بدل جاتی ہے اور ہر قوی ازروئے قوت قتل و نہب کا حق علانیہ منواتا ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ دنیا کے اماثلِ فکر اس ضمن میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ Adam de Hegedus اپنی کتاب The State of the World (1946) میں لکھتا ہے:

> یہ مسئلہ خواہ کتنا ہی الجھا ہوا کیوں نہ ہو (یہ حقیقت ہے کہ) دونوں جنگیں اسی نیشنلزم نے برپا کیں جو آج ہمارے وقت میں بھی قوی ترین سیاسی عنصر ہے۔ ان جنگوں کی تہ میں وہی فوقیت تھی جس نے دنیا کو آزاد و خود مختار قومی ریاستوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ ایسی قومی ریاستوں کا جداگانہ وجود ہی باہمی مقابلہ و پیکار کی مستقل دعوت ہے جو باہمی طور پر صحت مند معاشی تنظیم ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ گھناؤنا پہلو ہی نہیں کہ اس سے جنگیں برپا ہوتی رہتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ امن بالکل مفقود ہو چکا ہے۔ نیشنلزم تاریخِ عالم کی شر کل ہے۔ کسی اور انسانی شر کو اس کے مقابلہ میں نہ عالمگیر کہا جا سکتا ہے نہ کل۔ یہ نتیجہ نہایت آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ وطن پرستِ عام اس سے کہ اس کا جذبہ وطن پرستی کتنا مخلصانہ ہی کیوں نہ ہو، ترقی کا سب سے بڑا دشمن ہے اور مفادِ عالم کا سب سے بڑا غدار۔

Nationality in History and Politics اپنی کتاب Frederick Hertz میں اس نظریہ کی یوں تائید کرتا ہے:

> قومیت کی تشکیل میں مشترک نفرت ایک عام اور موثر عنصر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قریباً تمام قومیں عظیم جنگوں کی آغوش میں تشکیل پذیر ہوئیں اور دوسری اقوام سے طویل اور شدید عداوت کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئیں۔

پہلے اسی خیال کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتا ہے:

لارڈ ایکٹن نے ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا: قومیت کا مقصود نگاہ نہ آزادی ہے نہ خوشحالی۔ کیونکہ یہ دونوں قوم کو سٹیٹ کا قالب اور مقیاس بنانے کی اہم تر ضرورت پر قربان کر دی جاتی ہیں۔ یہ راہ مادی اور اخلاقی تباہی کی طرف لے جائیگی۔ ایکٹن کی پیش گوئی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ علمی سائنس نے وطنیت کی خدمت کر کے جو مادی تباہی پیدا کی ہے اس نقصان کی تلافی کہیں ایک پشت میں ہو سکے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وطنیت کے جس بت کی ہم پرستش کر رہے ہیں، اس کی ہم پر صرف یہی عنایات نہیں ہیں۔ دنیا کم از کم پچاس انتظامی حلقوں میں بٹ چکی ہے جنہیں اقوام کہا جاتا ہے۔ ہر قوم کی حدود میں ایک حکومتی مذہب ہے۔ وہ مذہب قومیت کو قدر مستقل یا خدا کے درجہ تک پہنچا کر اس کی پرستش کراتا ہے۔ پچاس قومی خداؤں میں سے کسی ایک کے پرستار ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ باقی خداؤں کے پرستاروں کے خلاف پیہم جنگ کی جائے۔ وطنیت اخلاقی تباہی کا موجب ہوتی ہے، کیونکہ اس سے عالمگیریت ختم ہو جاتی ہے اور اس سے انسان کی حیثیت بہ حیثیت انسان کالعدم ہو جاتی ہے۔ انسانوں کو انسانوں سے بے نیاز بنا دینے کی داعی ہے۔ یہ تکبر تفاخر اور تنافر پیدا کرتی ہے اور جنگ کی ضرورت اور حقانیت کا اعلان کرتی ہے۔

(Science, liberty and Peace)

یہ ہے مذہب وطنیت جو ڈین اِنج کے الفاظ میں "لامذہبیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے" (The Fall of the Idols, 1946) بے مذہب کا انسان بالآخر معاشرہ کے مسلمہ قوانین کا اتباع تو کرے گا، لیکن اقوام میں بٹی ہوئی دنیا میں بین الاقوامی روابط کی اساس میں کسی قسم کے اخلاقی ضوابط کا اثر دخل نہیں ہو سکتا۔ لارڈ گرے نے شہزادی لیون کو کہا تھا: میں پبلک اور پرائیویٹ اخلاق کا بہت دلدادہ ہوں، لیکن بین الاقوامی روابط تو اس قانون کے زیر اطاعت نہیں ہو سکتے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بین الاقوامی تصادم میں صالح لوگ یا اخلاق بے حقیقت اور بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ برسر اقتدار گروہوں کی نظر میں وہ بزدل اور ناکارہ قرار پاتے ہیں۔ وال پول کہتا ہے: کوئی بڑا ملک کبھی کسی نیک آدمی کے ہاتھوں بچ نہیں سکا کیونکہ نیک لوگ ان حدود تک نہیں جا سکتے جہاں تک جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

نیشنلزم انفرادیت ہی کی پھیلی ہوئی صورت کا نام ہے۔ جیسے افراد کی بے لگام خواہشات کی کل تکمیل دوسرے افراد کے خونِ حیات کی قیمت دئے بغیر ناممکن ہے، بعینہٖ یہی حال اقوام کا ہے، جو اپنی مزعومہ عظمت کے حصول کی تمنائے بیتاب کی خاطر فطرت کی قوتوں کو بے مہار چھوڑ دیتے ہیں اور دوسری قوموں کے گلے کاٹ کاٹ کر اپنی خون کی پیاس کو بجھاتی ہیں۔ اور

اس طرح وقتی طور پر نام نہاد اور بے معنی عظمت حاصل کر لیتی ہیں۔

ہم انفرادی آزادی کا عام چرچا کرتے ہیں۔ انفرادی آزادی بجا اور مسلّم، لیکن کسی فرد کو یوں کھلے بندوں نہیں چھوڑا جا سکتا کہ جو کچھ بھی اس کے جی میں آئے بے دریغ کرتا چلا جائے۔ اگر افراد کو یونہی کھلا چھوڑ دیا جائے تو نتیجہ مکمل فوضویت ہو گا۔ ایک معاشرہ کے قیام کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ افراد کی انفرادی خواہشات کی تحدید کر کے ایسا توازن پیدا کر دیا جائے کہ ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے متصادم نہ ہو سکے۔ معاشرہ صرف اسی توازن سے برقرار ہو سکتا ہے اور برقرار رہ سکتا ہے۔ اقوام پر بھی یہی کلیہ عائد ہوتا ہے کہ کسی ایک قوم کی آزادی کسی دوسری قوم کی آزادی سے متصادم نہ ہو سکے۔ انفرادی یا قومی آزادی کی اس تحدید سے مدعا ہرگز نہیں ہے کہ ان کی خواہشات اور تقاضوں کو فنا کر دیا جائے کیونکہ اس کا نتیجہ موت ہے۔ بلکہ اس تحدید کو صرف قیامِ توازن کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ہمارے بیشتر مسائل کی علت اصلی یہ ہے کہ ہم غیر متوازن و غیر ہموار نظام سے متعلق ہیں اور ہم مختلف سمتوں میں باہمی ڈر اور خوف سے دھکیلے جا رہے ہیں۔ یہ اسپِ ہزار سمت یعنی تہذیبِ حاضر بے لگام ہو کر سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں: (ہم) شاہراہِ حیات پر بھٹکتے پھر رہے ہیں بغیر یہ جانے کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں یا ہم جا ہی کیوں رہے ہیں۔ ہمارا کوئی ضابطہ نہیں، کوئی معیار نہیں، کوئی اقدار نہیں۔

انسانیت کے اس مرضِ جان گسل کی تشخیص کے بعد حکیمِ مغرب نے جو نسخہ تجویز کیا وہ "بین الاقوامیت" ہے۔ علمبردارانِ تہذیب نے بہ بانگِ دہل چار دانگِ عالم میں یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ یہی آبِ حیات ہے جس سے انسانیت اپنے فردوسِ گم گشتہ کی بازیافت کر سکے گی۔ لیکن یہ خوشی بالکل وقتی تھی کیونکہ انہی نقیبوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ انتباہ کرنا شروع کر دیا کہ ہم قعرِ ہلاکت کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے نگہِ بازگشت ڈالی اور دنیا کو بتایا کہ اس صدی کی پہلی جنگِ عظیم اس لئے لڑی گئی تھی کہ دنیا کو جمہوریت کی جائے پناہ بنا لیا جا سکے۔ انہوں نے فرشتۂ امن کو آسمانوں سے اترتے دیکھا، وہ دیوانہ وار لپکے اور اس کے ہاتھوں میں سے اس مرحلی بچی کو لے لیا جسے لیگ آف نیشنز کا نام دیا گیا۔ یہ لیگ آف نیشنز ایچ۔ ایل۔ ہیکن کے الفاظ میں: روزِ پیدائش سے ہی قبر میں اترنا شروع ہو گئی۔ جونہی اس کے مقصد کا اندازہ کیا گیا اس کے اجزا پریشان و منتشر ہونا شروع ہو گئے۔ نیم حکیم صورت گروں کے پرفریب شور و غوغا کے باوجود اس کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ جنگِ عظیم کے فاتحین کو جو مالِ غنیمت میسر آیا ہے وہ ان سے نہ چھن سکے۔ چنانچہ آغازِ کار سے ہی ان فاتحین میں سرپھٹول شروع ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئے۔

اس سے ان کے عزائم کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے سنہ ۱۹۱۹ء کو انسانی نااہلیت کا اہم ترین سال ثابت کر کے چھوڑا۔ ان

عزائم کے علاوہ اس کی ناکامی کے اسباب کہیں گہرے تھے۔

> لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ یہ بین الاقوامیت کی باطل بنیادوں پر قائم ہوئی تھی یعنی اس مفروضہ پر کہ خود مختار قومی وحدتوں یا حکومتوں کے مابین امن قائم رکھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کے نمائندے باہم مل کر اپنے اختلافات پر بحث و تمحیص کر لیں لیکن اپنے باہمی روابط میں کسی قسم کی بنیادی تبدیلی کے روادار نہ ہوں۔
>
> (Emery Reve's —— The Anatomy of Peace — 1945)

اس طرح ۱۹۱۹ء کی مریل بچی کا کوئی بیس سال بعد جنازہ اٹھ گیا اور اسے دعائے مغفرت کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اس دعائے مغفرت پران فوق البشروں کی برگزیدہ ملت نے آمین بالجبر کہی جنہوں نے تمام دنیا پر جہنم کے دروازے کھول دیئے۔ جونہی اس جہنم کے دروازے بند ہوئے خداوندانِ امن نے ۱۹۱۹ء کے جسد مردہ کو اکھاڑا اور اس کی بوسیدہ ہڈیوں کو جوڑ کر جمعیت اقوام متحدہ کا گوشت و پوست ان پر چڑھایا۔ اس جمعیت کی کارگزاری جنگ کے وہ بادل ہیں جو کبھی چھٹ نہ سکے اور جن کے پہلو سے وقتاً فوقتاً بجلیاں کوندتی اور گرجتی رہتی ہیں۔ اس کی جمعیت و تعمیری میں خرابی کی صورت مضمر ہے کیونکہ اس کا مفروضہ بھی یہی ہے کہ اقوام کے تصادم کی روک تھام بین الاقوامی قانون سے ممکن ہے۔

> حقیقت تو یہ ہے کہ اقوام کے مابین کوئی قانون کارفرما نہیں ہوتا سوائے زبردست کے قانون کے جو طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں کو زیردست بنائے رکھنے میں کامیاب رہتے۔ بالفاظ صحیح تر بین الاقوامی قانون، قانونِ جنگل ہے۔
>
> (Adam de Hegedus — The State of the World)

الغرض بین الاقوامیت کے آبِ حیات کو بھی آزما کر دیکھ لیا گیا ہے۔ وہ بھی سم قاتل ہی ثابت ہوا ہے۔ Emery Reves کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ وہ محولہ صدر کتاب میں ایک اور جگہ لکھتا ہے،

> ہم بین الاقوامیت کے کھلونے سے بہت مدت تک کھیل چکے ہیں۔ جو مشکل اس وقت ہمیں درپیش ہے وہ وطنیتوں کی نہیں، بلکہ اس بحران کی ہے جو انسانی معاشرہ میں وطنیت نے پیدا کر دیا ہے۔ اس کا حل نہ نیشنلزم (وطنیت) ہے نہ انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) ہی۔

ان خونیں تجربات سے گذر کر اب انسانیت عالمگیریت Universalism اور ایک عالمی حکومت کا تجربہ کرنا چاہتی ہے۔ اس تصور میں جاذبیت ہے اور میں ان خیالات کی تہ میں خلوص نیت کا جذبہ کارفرما دیکھتا ہوں۔ انسانیت کی مثال اس ڈوبتے شخص کی طرح ہے جو ہر ناتواں تنکے میں اپنے بچاؤ کے سامان دیکھتا ہے۔ وہ اپنی مشکلات کے حل کے لئے پریشان ہے اور کسی صحت بخش نسخہ کے لئے دہائی دے رہی ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات اور افرادِ انسانی سے متعلق موجودہ نظریات کے

پس منظر میں کیا یہ ممکن ہے کہ وحدتِ افراد کے لئے کوئی ایسی مشترک اساس تلاش کی جا سکے جو عالمگیریت اور عالمی حکومت کے قیام میں منتج ہو سکے؟

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے زندگی کے اس نقطۂ نگاہ نے جسے انفرادیت سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس پر موجودہ تہذیبِ مغرب قائم ہے، انسان اور انسان کے مابین تفریق اور مغائرت کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ موجودہ خلفشار اور عالمگیریت اسی تفریق اور مغائرت کے نتائج ہیں۔ یہ تصورِ حیات افرادِ انسانی کو نہ متحد کر سکتا ہے اور نہ ان میں متجانست پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ یہ مطلوبہ نتیجہ بیرونی عناصر سے پیدا کرنا چاہتا ہے اور ان تقاضوں کو یک قلم فراموش کر دیتا ہے جو قلوبِ انسانی کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں۔

اس سوال کا جواب سوچا جا سکتا ہے، لیکن ایک جداگانہ اور اعلیٰ طرزِ استدلال سے۔ یہ جواب اسلام میں ملے گا جس کا سرچشمہ قرآن ہے۔ میں آپ کو ایک طے شدہ جواب نہیں دے رہا، نہ میرا مقصد اپنے ذاتی عقیدہ کی آسان تبلیغ ہے۔ اسلام اور قرآن کے نام سے عموماً مذہبی قسم کی حکومت کا تصور سامنے آتا ہے۔ یقین جانئے یہ تصور یکسر قرآن کی روح کے منافی ہے۔ یہ نتیجہ ہے قرآن سے جہالت یا خلافِ قرآن تعصب کا۔ اسلام کے نام سے آپ یہ بھی نہ سمجھ لیجئے کہ میں اس اسلام کا ذکر کر رہا ہوں جو آج نام نہاد مسلمانوں کا مذہب ہے اور جس کی حیثیت چند رسوماتِ ظاہری کے مجموعہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسلام کے نام لیواؤں نے غلطی سے ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا ہے اور اس طرح اپنی حرکت کو اپنے عمل کو مبدل بہ سکون کر لیا ہے۔ ان میں جمود بھی ہے اور مسکنت بھی۔ وہ اسلام سے اتنے ہی دور ہیں جتنا ایک جامد شے متحرک شے سے دور ہوتی ہے۔

فلہٰذا میں آج کی صحبت میں جو کچھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ محض ایک عقیدہ کی تائید و تبلیغ نہیں، بلکہ سائنسی استقرائی تجربات بھی اس کے موید ہیں۔

جدید طبیعیاتی تحقیقات اس مرحلہ پر پہنچ چکی ہیں کہ مادہ کا پرانا تصور کہ وہ ایک بے جان ڈلے کی طرح فضا میں پڑا ہے بالکل باطل قرار پا چکا ہے۔ اس کے بجائے اب مادہ سے متعلق یہ تصور قائم ہو چکا ہے کہ مادہ (برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں) "خیالات گزراں" ہیں یا (ایڈنگٹن کے الفاظ میں) "خالص حرکت"۔ مادہ سے متعلق نظریہ میں اس انقلاب کی وجہ سے حیات کا پرانا تصور کہ وہ مادہ کی پیداوار ہے بے سروپا ہو جاتا ہے۔ خود علمائے طبیعیات اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ حیات کی اساس غیر مادی ہے اور اس کا منبع مابعد الطبیعاتی ہے یا خالص توانائی۔ میں نے "روح" کا لفظ عمداً استعمال نہیں کیا کیونکہ اس سے بہت سی غلط وابستگیاں ہیں حالانکہ سائنسی نقطۂ نگاہ سے غیر مادی پہلو کو دنیائے روح کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہونے کی بدولت روح ہمہ جا موجود ہے اور اس کے تسلسل میں کہیں کوئی رخنہ

نہیں ملتا۔ انسان بہ حیثیت افراد مادہ کی مخصوص شکل ہیں اور وہ فضا میں مادی اجسام بھی رکھتے ہیں اور ایک مسلسل اور ہمہ جا موجود بالائے مادہ نفس بھی ہیں جو نہ محض دیگر مظاہر مادی کی طرح باشعور ہے بلکہ صفت خود شعوری Self Conciousness سے بھی متصف ہے۔ یہ صفت خود شعوری انسان کا طغرائے امتیاز ہے اور اسی سے انسان معلوم کائنات کی مخلوق سے متمائز ہوتا ہے۔ قرآن کے نزدیک تو حید انسانیت کی اساس زندگی کی رو کی ایک غیر مادی وحدت ہے۔ اور ہم نے تمہیں ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا ہے" (۴/۱) قرآن نے اس نظریہ کو پہلو بدل بدل کر متعدد مقامات پر بیان کیا ہے اور اس کا اطلاق عمومی طور پر انسانیت پر کیا ہے، اور اسے کسی خاص فرد یا گروہ، یا فرقہ یا قوم یا ملک تک محدود نہیں کیا۔ اسی طرح انسانیت کی توسیع و ترقی ایک مکمل اور متوازن وحدت کی حیثیت سے ہوگی۔ قرآن میں ہے:

"تمہاری خلقت و بعثت ایک نفس واحد کی سی ہے" (۳۱/۲۸)

قرآن نے یہ نظریہ بیان کر کے محض علمی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اس کے بیان سے ایک مقصد کی تکمیل مقصود ہے اور وہ مقصد یہی ہے کہ انسانیت کو ایک ہیئت واحدہ میں منظم کرنے کے لئے اسی نظریہ کو بطور اساس استعمال کرنا چاہیے۔

سائنسی تحقیق نے بتایا ہے کہ انسان سطح ارض پر زندگی کے طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ قرآن نے چودہ سو سال پیشتر اسی کا اعلان کیا لیکن قرآن اس سے آگے بھی بڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ جب انسان اپنی مادی زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے اس زمین پر مترتب کرے گا جو متحرک ہموار اور متوازن ہوگی تو روحِ انسانی کی توسیع و ترقی کی راہیں کشادہ ہوں گی۔ . . . . . توسیع و ترقی انسانیت کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ البتہ انسانیت کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو شعوری طور پر اور بطیب خاطر اس پر کاربند ہو جائے یا قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی میں تجربے کر کر کے ناکام ہو ہو کر اور عدم توازن اور ناہمواری کے تمام خمیازے بھگت کر بالآخر اسی جانب آئے۔ کائنات کے اس اساسی قانونِ حیات کا نام قرآن کی اصطلاح میں "صراطِ مستقیم" یعنی حرکت میں استواری اور توازن کی راہ یا بالفاظِ دیگر حرکیاتی توازن . . . . . Dynamic Equilibrium ہے۔

یہی وہ اصول یا قانونِ اساسی ہے جو ہماری اجتماعی زندگی پر بہ حیثیت کل اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی سے ان قوائے فطرت کے استعمال پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر عدم قدرت سے ذریعہ تعمیر بننے کے بجائے ہماری تباہی کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہی قوانین جب افرادِ معاشرہ پر بحیثیت افراد اثر انداز ہوتے ہیں تو خارجی و داخلی عناصر میں توازن پیدا کر دیتے ہیں، کیونکہ قرآن کی رو سے ایک ہی قانون ہے جو مادی مظاہر (خلق) اور مابعد الطبیعات یا نفس (امر) پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے (۷/۵۴) یہ ہے قرآن کے نزدیک وہ اساس جس پر وہ نظامِ عالم استوار کیا جا سکتا ہے جس کے لئے دنیا بھر میں ایک شعور

بچ رہا ہے۔ یہ حل یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ قرآن یہ نظریہ دے کر ایک عملی طریقہ بھی بتاتا ہے تاکہ ہمواری، توازن یا وحدت انسانیت کا حصول ممکن ہو جائے۔ ایک خدا یا آخری الغو کی اطاعت کا سبق دیکر قرآن ایک ایسے اساسی قانون کی اطاعت کی تعلیم دیتا ہے جو ساری انسانیت کے سارے اعمال پر کارفرما ہے۔ یہ قانون ان تمام انسانوں کے مابین مکمل مساوات پیدا کرتا ہے جنہیں اسلام ایک رشتۂ اخوت میں پرو کر ایک واحد اور باعظمت خاندان کے ارکان بنا دیتا ہے۔ جنہیں برابر کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور جو باہمی طور پر یکساں ذمہ داریاں رکھتے ہیں۔ اس اساسی سرچشمۂ قوانین کی اطاعت چھوڑ کر دیگر قوانین کی اطاعت (یعنی ایک اللہ کو چھوڑ کر اور خداؤں کے سامنے جھکنا) انسان کو مرتد بنا دیتا ہے۔

یہ عملی طریقہ سادہ اور حسین اجتماعی طریقہ ہے جس کی رو سے یہ اجتماعی عہد یا احیائے میثاق کیا جاتا ہے کہ ہم ایک ہی قانون کے پابند اور مطیع ہیں اور اس توحید سے انسان اور انسان میں اخوت اور مساوات کے رشتے مستحکم کرتے ہیں۔ یہ اجتماعیت وہ آخری 'میدان' مہیا کرتی ہے جہاں انسانیت اپنے مسائل کا حل قرآن کے قانونِ اساسی کی روشنی میں تلاش کرتی ہے، ایک ہی امیر کی متابعت میں جسے ملت جمہوری طریق سے ازروئے اہلیت منتخب کرتی ہے اور اضافیات کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ اس سادہ طریقِ کار سے جو ملت معرضِ وجود میں آتی ہے وہ اپنے ارکان کے لئے لازمی قرار دیتی ہے کہ وہ رفاہِ انسانیت کے لئے ملی خزانہ میں منصفانہ عطیے داخل کرتے رہیں تاکہ اس طرح ملت کی مسلسل و متواتر ترقی ہو سکے۔ اگر اسلامی قوانین پر عمل درآمد کیا جائے تو معاشرہ کے ارکان میں دولت کی گردش منصفانہ رہے اور معاشرت اجتماعی طور پر ایک متوازن وحدت کی حیثیت سے آگے بڑھے اور ترقی کرے۔

اسی طرح روزے کے آسان طریقہ سے 'جو عملی بھی ہے اور کم سے کم تکلیف دہ بھی' یہ نظام اپنے پیرووں میں خصوصی نظم و ضبط پیدا کرتا ہے تاکہ وہ مادی اشیاء کے حصول کی خواہشات کو قابو میں رکھ سکیں۔ یوں نفس بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے اور جسم مادی اشیاء کا کم سے کم محتاج اور ان سے کم از کم وابستہ ہو جاتا ہے۔ اپنی عادات کی غلامی سب سے بڑی غلامی ہے اور اس ذریعہ سے اس غلامی سے انسان کو مکمل طور پر آزادی دلا دی جاتی ہے۔

اسلام زندگی کا عملی اور حرکیاتی نظام ہے۔ اس لئے سکون و تعطل اس کے ہاں روا نہیں۔ یہ زندگی کے تمام شعبوں میں متواتر و مسلسل سعی کی دعوت دیتا ہے، اور یہ اہتمام کرتا ہے کہ بجائے اس کے کہ مادہ انسان پر غلبہ پائے، انسان مادہ پر غلبہ پالے کیونکہ قرآن کے نزدیک کائنات کی ہر شے انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اور وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق اسے کام میں لا سکتا ہے۔

قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ایسے اساسی اصول بیان کرتا ہے جن کا نفاذ ہیئتِ انسانیہ میں عدل و توازن کے

قیام کے لئے ناگزیر ہے۔ ان اصولوں کی معین حدود میں وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ مطلوبہ نتائج کی ترتیب کے لئے وہ اپنا لائحہ عمل تیار کرے اور اس پر عمل پیرا ہو۔ یہ تمام انسانوں کو ایک مشترک قسم کی آزادی دیتا ہے اور تمام پر مشترک قسم کی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ قرآن نظری طور پر ہی عدل و انصاف پر مبنی اصول بیان نہیں کرتا بلکہ منتشر اور متفرق معاشرت میں ہمواری اور توازن قائم کرنے کا عملی طریق کار بھی مہیا کرتا ہے۔ جس قانونِ جنگل کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کی رو سے تو زندہ رہنے کا حق صرف اصلح ہی کو حاصل ہے۔ قرآن کا اصول اس سے مختلف ہے۔ قرآن زندہ رہنے کا حق، اصلح کو نہیں بلکہ انفع کو عطا کرتا ہے، یعنی ایسے شخص کو نہیں جو تن و توش یا قوت میں دوسروں سے بڑھ کر ہے بلکہ جو مجموعی طور پر انسانیت کے لئے نفع رساں ہے۔ وہ ایک طرف یہ اصول وضع کرتا ہے کہ کسی فرد کو اس کی سعی کے ماحصل سے محروم نہیں کیا جاسکتا، اور دوسری طرف یہ تحدید بھی کر دیتا ہے کہ جن کے پاس ضروریات سے فاضل مال ہو وہ ان کی کمی پوری کریں جن کے پاس ضروریات کے لئے کافی مال نہیں۔ بشرطیکہ آخرالذکر طبقے نے کم کوشی کا ثبوت نہ دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ قرآن تمام ارکانِ ہیئت کو تربیت و نشو و نما کے مساوی مواقع مہیا کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ انسانیت کی ترفیع کے لئے جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم سے گریز کرتے ہیں قرآن کھلے الفاظ میں ان کی مذمت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ انھیں اپنے انہی اعمال کی بدولت ذلت و مسکنت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسلام کا نظریہ توحیدِ الٰہی اپنے اندر یہی حکمت مخفی رکھتا ہے کہ تمام ہیئتِ انسانیہ کے لئے ایک ہی قانون نافذ و رائج ہو سکتا ہے اور وہی قانونِ واحد مکمل ہمواری اور توازن پیدا کرنے کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ جب تک یہ توازن قائم نہیں ہو جاتا حیات میں صعودی ارتقاء کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

جو لوگ اس طرح انسانیت کی ترقی و ترفیع کے قائل بلکہ کوشاں ہیں، قرآن انھیں ایک ملتِ واحدہ، یعنی مسلم، قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ انسانیت کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں وہ قرآن کی رو سے دوسری ۔ مخالف ۔ ملت یعنی کافر ہیں۔ اس فرق کے سوا علاوہ قرآن انسان اور انسان کے مابین کسی اور فرق کا روادار نہیں۔

اس مختصر سی صحبت میں یہ گنجائش نہیں نکل سکے گی کہ میں اس عملی طریق کار کا بھی جائزہ لوں جو قرآن اس مقصد کے حصول کیلئے تجویز کرتا ہے۔ اس بحث کو میں فرصتِ آئندہ پر اٹھا رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دنیا بالآخر قرآن کی ہی ہدایت قبول کریگی۔ میں یہ اپنے عقیدہ سے متعلق خوش فہمی کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ یہی رائے عہدِ حاضر کے ان مفکرین کی بھی ہے جنھوں نے عصرِ حاضر کے محرکات اور تقاضات کا انصاف اور ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا ہے۔ جن مفکرین کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس نظریہ کا مؤید بننا پڑا ہے ان میں سے برنارڈ شا، آرنلڈ ٹائن بی، برگسان، الڈس ہکسلے، ایڈنگٹن اور ولیم جیمز کے نام مشتے نمونہ از خروارے قابلِ ذکر ہیں۔

مثنوی اسرارِ خودی

علامہ اسلم جیراجپوری

طلوع اسلام کے اقبال نمبر (بابت اپریل سنہ ۱۹۵۰ء) میں ہم نے علامہ اقبال کا مکتوب بنام علامہ اسلم جیراجپوری شائع کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ علامہ اسلم صاحب کا مضمون متعلقہ مثنوی اسرار خودی کسی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون پہلی بار رسالہ "الناظر" بابت فروری سنہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اسے بہت پسند کیا تھا جس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو اقبال نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

ڈاکٹر اقبالؒ کی مثنوی اسرارِ خودی جب سے شائع ہوئی ہے اس وقت سے اس پر مخالفین کے اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس مثنوی میں تصوف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کو بدو گوسفند لکھا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

راہبِ اول فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نا مشہود گشت
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات

خواجہ حافظ کے متعلق لکھا ہے:۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ او — از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیشِ ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملتِ میخوارگاں — آں امامِ ملتِ بیچارگاں

گوسفند است ونوا آموخت است   فتنہ وناز ودا آموخت است

دلربائی ہائے او زہر است وبس   چشم او غارت گر شہر است وبس

از گروہ یوناں زمیں زیر گرا است   پردۂ عودبش حجاب اکبر است

بگذر از جامش کہ در مینائے خویش   چوں مریدان حسن دارد حشیش

محفل او درخور ابرار نیست   ساغر او قابل احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر ۔   الحذر از گوسفنداں الحذر

مخالفین کو افلاطون کی نسبت کم لیکن خواجہ حافظ کی بابت زیادہ ملال ہے، کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مقدس بزرگ بھی تسلیم کئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے حمیت کے جوش میں وہ بھی ڈاکٹر صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں ۔ میں ایک عرصے سے اس بحث کو دیکھ رہا تھا لیکن اس وجہ سے خاموش تھا کہ یہ اصولی بحث نہ تھی ۔ چند روز ہوئے میرے پاس مثنوی "راز بیخودی" ایک دوست کے ذریعہ سے پہنچی جو خان بہادر پیرزادہ مظفر احمد صاحب متخلص بہ فضلی پنشنر ڈپٹی کلکٹر محکمۂ انہار پنجاب نے "اسرار خودی" کے جواب میں لکھ کر شائع کی ہے ۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کچھ ضرور ان مثنویوں پر لکھوں ۔ اس لئے مجبوراً مہر سکوت کو توڑنا پڑا ۔ لیکن میرے اس لکھنے کا منشا صرف یہ ہے کہ اس بحث کو اصل مرکز پر لاؤں تاکہ آئندہ موافقین یا مخالفین جو کچھ لکھیں وہ قوم کے لئے مفید ہو، ذاتیات سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا ۔

احترام سلف ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا[1] کیونکہ اس کی وجہ سے ایک تو خود ان کی ذات پر حملے ہونے لگے اس لئے کہ قدیمی اصول ہے ۔

بزرگش نخوانند اہل خرد   کہ نام بزرگاں بزشتی برد

دوسرے نفس مسئلہ جو مفید تھا ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آگیا ۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب جنھوں نے اس دھوم دھام سے اس مثنوی کا جواب لکھا ہے وہ بھی اصلی بحث کو نظر انداز کر گئے اور صرف افلاطون اور حافظ کی مدح سرائی اور ڈاکٹر صاحب پر شلیں چست کرنے میں مشغول رہے ۔ بز و گوسفند کے جواب میں کہیں شغال اور کہیں خر بنایا ہے اور دشمن اسلام اور رہزن اسلام وغیرہ خطابات بخشے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

خود زما خیلے بے وحشت سگال   جامہ زن در نیل دستاں چوں شغال

---

[1] میں خوش ہوں کہ اس مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ خواجہ صاحب کے متعلق لکھا تھا اس کو حذف کر دیا اور اس کے بجائے نئے اشعار لکھ دیئے، لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کا مفید اور دلچسپ دیباچہ بھی نکال ڈالا گیا جس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۔

فلسفی فطرت زدیں برگشتگاں — در بیابانِ جنوں سرگشتگاں
عقل و دین و دادرا دشمن ہمہ — در لباسِ سخنگاں رہزن ہمہ
از دمِ گفتار دستاں داستاں — فلسفہ در دل تصوف بر زباں
دشمنِ جاں آمدند اسلام را — رہزنِ جاں آمدند اسلام را
وائے بر ایں بخنگانِ عقل خام — اولیا را میش و بز کردند نام
از دمِ مکر شغالاں الحذر — الحذر از بد سگالاں الحذر

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

ازخودی بیغارہ زن اسلاف را — کردہ پامالِ جنوں انصاف را
بندۂ دنیا بہ دنیا دیں فروش — سربسر ملت فروش آئیں فروش

پیرزادہ صاحب کے ان اقوال کو جب صوفیانہ حلم اور حسنِ ظن کی میزان میں ہم تولتے ہیں تو ان کی سُبکی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی رائیں پہلے سے بھی لوگوں کی چلی آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ اس کے اول مجرم نہیں ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ بادشاہ عالمگیر نے عام منادی کرادی تھی کہ دیوانِ حافظ کوئی نہ پڑھے۔ کیونکہ لوگ اس کے ظاہری معنی سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔ نیز مولانا حالی مرحوم نے حیاتِ سعدی میں لکھا ہے:

> خواجہ حافظ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ غرضکہ کسی شے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر، مآل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزادگی، رسوائی، بدنامی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولتِ دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کام نہ لینا، توکل و قناعت کے نشہ میں اپنی ہستی مٹا دینا اور جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجابِ اکبر جاننا، حقایقِ اشیا میں کبھی غور و فکر نہ کرنا، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً کھو دینا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں اس سے مستفاد

ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بیفکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت وبلاغت اور مطرب ورقاصہ کی خوش آوازی اور حسن جمال اور مزامیر کی لے ان کو نے اُڑتی ہے اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں، جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گذری ہے اور جن کا شعر شریعت کا لبِ لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشین ہوتے ہیں۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک ابرار واحرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل استغنا وقناعت کا پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش والواط کو بے فکری ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی ورسوائی کی ترغیب ہوتی ہے، اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔

ہم نے خود اپنی تصنیف "حیاتِ حافظ" میں ان راویوں کو نقل کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، لیکن ہمارے جواب کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "حسن کا معیار یہی ہے کہ وہ کمال درجہ کا دلکش ہو۔ عشاق کی رسوائی سے حسن برا نہیں قرار پا سکتا۔" باقی حافظ کی غزل کے ان اثرات سے جو مولانا حالی نے لکھے ہیں کون انکار کر سکتا ہے! بے شک یہاں تک ہم پیرزادہ صاحب کے ساتھ ہیں کہ

الادب بیچارہ بر ستاں مزن | شیشۂ خود بر سرِ سنداں مزن
درگذر از بادہ خواراے محتسب | مست را معذور دار اے محتسب

لسان الغیب مولانا حکیم فیروز الدین احمد صاحب طغرائی نے ڈاکٹر صاحب کے جواب میں جو رسالہ لسان الغیب کے نام سے شائع کیا ہے اس میں جو پہلو جواب کا اختیار کیا ہے وہ "سوال از آسماں وجواب از ریسماں" کا مصداق ہے۔ شعراء اور تذکرہ نگاروں نے کلام حافظ کی جو مدح کی ہے وہ شاعری اور صوفیانہ رموز کے لحاظ سے ہے، اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کلام کی ان خوبیوں کو ڈاکٹر صاحب بہ نسبت حکیم صاحب موصوف کے زیادہ سمجھتے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ اُن اثرات کے متعلق ہے جو خواجہ صاحب کے کلام سے جذبات پر پڑتے ہیں۔ اس لئے اُن محامد ومدائح کا نقل کر دینا جو ڈاکٹر صاحب کے بھی پیش نظر ہیں جواب کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں حکیم صاحب موصوف نے شعر العجم سے بہت کچھ استدلال فرمایا ہے کہ علامہ شبلی نے کلام حافظ کو چناں وچنیں لکھا ہے۔ مگران کو یہ خبر نہیں کہ اسی شعر العجم میں عمر خیام کے تذکرہ میں ہے کہ -

افسوس ہے کہ خیام خواجہ حافظ کی طرح صوفی نہ تھا ورنہ اس کی شراب بھی شرابِ معرفت بن جاتی -

اسرارِ خودی میں خواجہ حافظ کے جن اشعار کی طرف تلمیح ہے ان کے جو لطیف معانی حکیم صاحب نے بیان کئے اور جو جو صوفیانہ نکات ان سے نکالے ہیں وہ ہر شاعر کے ہر شعر سے نکالے جاسکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کچھ عرصہ ہوا میں نے کسی مضمون نگار کا مضمون پڑھا تھا۔ جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خواجہ آتش لکھنوی کا کلام تصوف اور معرفت سے لبریز ہے، اور اس کے شواہد بھی لکھے تھے۔ نیز بمبئی کے کسی اخبار میں ایک گبر کا یہ دعویٰ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ خواجہ حافظ آتش پرست تھے۔ مدعی نے خود حافظ کی غزلوں سے اس پر استدلال کیا تھا۔ منجملہ ان کے ایک غزل جو مجھے یاد رہ گئی یہ ہے:

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود — بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بسجود

اس غزل کے مندرجۂ ذیل شعر کو اس نے اپنے اس عجیب و غریب دعوے کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔

بباغ تازہ کن آئین دینِ زردشتی — کنونکہ لالہ برافروخت آتشِ نمرود

حافظ و عرفی

ہم کو سب سے زیادہ جو بات مثنوی اسرار خودی میں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے:-

حافظ جادو بیاں شیرازی است — عرفی آتش بیاں شیرازی است

ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند — واں کنارِ آب رکنا باد ماند

ایں قتیل ہمتِ مردانہ — آں نیِ رمز زندگی بیگانہ

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز — زندم - از صحبتِ حافظ گریز

اس لئے کہ اگر شاعری ہی کے دائرہ میں رہنا ہے تو حافظ کو چھوڑ کر عرفی کو مقتدا بنا لینا بعینہ اس مثل کا مصداق ہے "فرمن المطر ووقع تحت المیزاب"

حقیقت یہ ہے کہ ہماری شاعری خرِ دجال ہے خرِ عیسیٰ نہیں ہے اس کے چند مخصوص عنوانات ہیں جن کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انھیں کو شعراء الفاظ کے نئے نئے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ زندگی کے لئے کسی علمی شاہراہ کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ سوائے ادبی لطافت کے کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہے۔ قرآن شریف نے جس شاعری کو مذموم قرار دیا ہے اس کا بہترین یا بدترین نمونہ یہی ہے۔ الا ماشاءاللہ۔ مولانا حالی نے بہت صحیح فرمایا ہے

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر
ہوا علم دیں جس سے برباد سارا وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

عقیدتمندی نے خواجہ حافظ کے کلام پر پھر بھی تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا ہے، عرفی کا کلام تو اس سے بھی عاری ہے رہیں ادبی خوبیاں تو اُن کے لحاظ سے خود عرفی اسی شمع کا پروانہ ہے۔ کہتا ہے:

بگردِ مرقد حافظ کہ کعبۂ سخن است درآمدیم بعزم طواف در پرواز

بیشک نخوت اور خودستائی کہیں کہیں اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، لیکن وہ خود ڈاکٹر صاحب کی مصطلحہ خودی کے متضاد ہے۔

بحث خودی

پیرزادہ صاحب نے خودی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خواجہ حافظ کے جوشِ حمایت میں ڈاکٹر صاحب کے مفہوم و مقصود کو سہواً یا قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو صاف لکھدیا ہے کہ "خودی کو بمعنی غرور میں نے استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کا مقصود محض احساسِ نفس یا تعین ذات ہے"۔ باوجود اس تصریح کے اس لفظ کے جو معنی انھوں نے خود ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے نکالنے کی کوشش کی ہے اس میں صریحی طور پر انصاف سے تجاوز کر گئے ہیں، اس لئے کہ جب کوئی لفظ کسی اصطلاحی معنی میں رکھ لیا گیا تو اس کے لغوی معنی لیکر اعتراض کا پہلو نکالنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس شعر پر

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت

جو اعتراض پیرزادہ صاحب نے کیا ہے کہ اس کا انبیاء کی عظمت و شان پر اچھا اثر نہیں پڑتا ہم بھی اس سے متفق ہیں، لیکن ہمارا جہاں تک خیال ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ مضمون اس کلام سے اخذ کیا ہوگا جو کسی بزرگ صوفی کا ہے۔

صد ہزاراں سبزہ پوش از غم بسوخت تا کہ آدم را چراغے بر فروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح تا دریں حضرت در دگر گشت نوحؑ
صد ہزاراں پشہ در لشکر فتاد تا براہیمؑ از میاں سر بر نہاد
صد ہزاراں خلق سر ببریدہ گشت تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنار شد تا کہ عیسیٰ محرم اسرار شد
صد ہزاراں خلق در تاراج رفت تا محمد یک شبے معراج رفت

خودی کا عرفی مفہوم مراد لیکر پیرزادہ صاحب نے جو اعتراضات کئے ہیں ان تیروں کا نشانہ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں،

کیونکہ انھوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث بالکل لفظی ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ طبیعت نے جب مسلمانوں کے تنزل کے اسباب وعلل دریافت کرنے کی طرف توجہ کی تو یہ سراغ پایا کہ امت اسلامیہ سے قوتِ عمل فنا ہو گئی اور جو عملی ولولہ اور جوش سلف میں تھا وہ خلف میں نہیں رہا، اور چونکہ ترقی کا مدار عمل پر ہے اس لئے پھر اسی قوتِ عمل کو زندہ کرکے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اس قوتِ عمل کے احیاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کو اپنی ہستی کا بھی احساس ہو۔ اسی نظریہ کی تعلیم کے لئے انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہے خودی کی تعریف میں کہتے ہیں۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست   ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او   غیرِ او پیداست از اثباتِ او
می شود از بہرِ اغراضِ عمل   عامل و معمول و اسباب و علل
زندگی محکم ز ایقاظِ خودی ست   کاہد از خوابِ خودی نیرمے زیست

اس مفہوم کو مثنوی رموزِ بیخودی میں اور بھی صاف کر دیا ہے۔

تو خودی از بیخودی نشناختی   خویش را اندر گمان انداختی
جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو   یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو
واحد است و بر نمی تابد دوئی   من ز تابِ من منم تو از توئی
خویش دارد خویش باز و خویش ساز   نازہا می پرورد اندر نیاز
خوگرِ پیکارِ پیہم دیدمش   ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں۔

ہر چہ گفتی از خود حاشا غلط   سر بسر از لفظ تا معنی غلط
در حیاتِ کس خودی را دخل نیست   خلقِ عالم نورِ بی این نخل نیست
در حریمِ حق خودی را نیست بار   در حرم مزدورِ دیوان را چہ کار
از خودی بگذر کہ کار این ست و بس   خاصہ مسلم را شعار این است و بس

دراصل پیرزادہ صاحب خودی کے لفظ ہی سے بیزار ہیں کہتے ہیں۔

اے خودی را مرکبِ خود ساختی | دبۂ درپائے پیل انداختی
اے خیالِ خامت اسرارِ خودی | پختہ کارِ راز پندارِ خودی
زہر را تریاق می گوئی بگوئے | بر ہلاکِ خویش می پوئی بپوئے
در عیارستانِ بازارِ صفا | سکۂ قالِ تو باشد ناروا

ہم کو حیرت ہے کہ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں پیرزادہ صاحب منصور حلاج کے "انا الحق" کے تو نہایت سرگرم حامی ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی "انا، انا" سے اس قدر بیزار۔!!

منصور کی حمایت میں فرماتے ہیں

زاہداں منصور را خوں کردہ اند | بیکس و معذور را خوں کردہ اند
مردِ حق گو را بدار آویختند | بے گنہ را خوں بناحق ریختند
ہلا اے زہادِ آشفتہ دروں | ہلا اے ستیزہ کارانِ جنوں
خونِ منصور از شما خواہم گرفت | خفتہ خوں را خوں بہا خواہم گرفت

ڈاکٹر صاحب نے حکیم افلاطون کی جو مذمت "مسئلہ اعیان" کی وجہ سے کی ہے اس کے جواب میں پیرزادہ صاحب نے شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب تلویح سے ایک کشفی فضیلت نقل فرما کر اس کی مدح سرائی فرمائی ہے۔ فلسفۂ استدلال جاننے والوں کے لئے یہ جواب ایک لطیفہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مذکور نے ارسطو کو دیکھا کہ وہ افلاطون کی مدح میں سرگرم ہے۔ پوچھا کہ اس کے درجے کا کوئی اور حکیم نہیں؟ ارسطو نے کہا نہیں، پھر مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کے نام لئے ارسطو نے سوائے بایزیدؒ کے اور کسی کو افلاطون کا ہم مرتبہ نہ بتایا۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب اسی بنیاد پر اس کی بابت کہتے ہیں۔

جبرئیلے در لباسِ آدم است

ہم کو امید تھی کہ پیرزادہ صاحب حافظ کی مدافعت زیادہ جوش کے ساتھ کریں گے لیکن یہاں مضمون بہت ہی مختصر نکلا۔ کہتے ہیں۔

اے کہ حافظ را شماتت میکنی | رندِ میکش را ملامت میکنی
اے بعلمِ خویش مغرورِ عمل | تو چہ دانی سرِ مستانِ ازل

بحثِ تصوف اصل مرکزی بحث یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام ایک حقیقی پیغامِ عمل ہے۔

باوجود پیرو اسلام ہونے کے موجودہ مسلمانوں میں جو جمود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ایک بیرونی عنصر مذہبی رنگ میں آکر غالب ہو گیا ہے اور وہ تصوف ہے۔ اسی تصوف کے مسئلہ فنا اور نفس کشی[1] نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔ کیونکہ تصوف کا اثر تمام ادبیاتِ اسلامیہ میں ساری ہو گیا ہے اور ہر قوم کے ادبیات کا ایک تدریجی اثر اس قوم کے جذبات اور قوائے نفسانیہ پر ہوتا ہے، اس لئے رفتہ رفتہ اس کے اثر سے ہماری قوتِ عمل جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مسئلہ نفی خودی کو بنی نوعِ انسان کی مغلوب قوموں نے ایجاد کیا ہے کہ اس تعلیم سے مخفی طور پر غالب قوموں کو کمزور بنائیں۔

یونان میں فلسفۂ اشراق اور ایران میں تصوف پھیلا اس وجہ سے ضمناً افلاطون اور حافظ کا بھی تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے اپنی مثنوی کے دیباچے میں خود انھیں کے الفاظ میں نقل کیا، یہ ہے:

(۱) تصوف رہبانیت سے پیدا ہوا ہے۔

(۲) اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔

(۳) تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(۴) تصوف قیودِ شرعی کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور اس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے بلکہ انھوں نے خود تحقیقات کی ہے۔

(۱) میرے آباؤ اجداد کا مشرب تصوف تھا اور خود میر امیلان بھی تصوف کی طرف تھا۔

(۲) فلسفۂ یورپ کے پڑھنے سے اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہو گئی تھی کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیتِ مجموعی منجر بہ تصوف ہے۔

(۳) قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کو پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ تصوف اور فلسفۂ یورپ بھی غلط ثابت ہوا، اس واسطے میں نے تصوف کو ترک کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا نسبی تعلق ایک قدیم صوفیانہ خاندان سے ہے، میرے آباؤ اجداد نے نسلاً بعد نسلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت سے جو میرے جدِ اعلیٰ ہیں اس وقت تک تصوف کے دامان تربیت میں پرورش پائی ہے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ "اسلام عین تصوف ہے اور تصوف عین اسلام ہے"۔

مسئلہ عینیت تصوف کا مسئلہ "عینیت" افلاطون کے مسئلہ "اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ "ہمہ اوست" کے عقیدہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ہر ذرہ عین آفتاب ہو گیا

[1] تصوف نفس کشی سکھلاتا ہے، لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، وہ صرف اصلاح نفس کا خواہاں ہے۔

اور خالق اور مخلوق متحد ہو گئے چند اقوال بطور امثال کے لکھتا ہوں۔

"انا الحق"

"سبحانی ما اعظم شانی"

"سبحان الذی خلق الاشیاء وہو عینہا"

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ — خود بر سر بازار خریدار برآمد
خود انا الحق زد از لب منصور — خود برآمد ز شوق بر سر دار
گفت[1] انا احمد بلا میم — از زبان محمد مختار
ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست — خیال آب و گل در رہ بہانہ

یہاں تک کہ بعض یکہ تازان میدانِ تفرید کلمۂ توحید کو بھی شرک خیال کرتے ہیں۔

اے پسر لا الٰہ الا اللہ — خود ز شرک خفی است آئینہ دار
ہست شرک جلی رسول اللہ — خویشتن را ازیں دو شرک برار

ایک اور سرمست کا ترانہ سنئے۔

من ہم زمینم ہم سما، من با تو ہستم جملہ جا — من مصطفیٰ را ہم خدا، من ملحدِ دیرینہ ام

فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے امتیازی حدود بھی مٹ گئے۔

چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد — موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

تجرید کا یہ نعرۂ مستانہ بھی سن لیجئے، جس میں قافیہ کی پابندی بھی ترک کر دی گئی ہے۔

سر برہنہ نیستم دارم کلاہِ چار ترک — ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولا ترکِ ترک

ان "شطحیات" کا ایک انبار ہے، ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ نا آشنائے سرِ وحدت کا قلم لرزتا ہے، اور یہ اُن حضرات کے اقوال ہیں جن کا ایک ایک لفظ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں بے بہا جوہر سمجھا جاتا ہے ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے۔

---

[1] خود ڈاکٹر اقبال کو بھی یہ میم پسند نہیں آیا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے — قوم دنیا میں یہی احمدِ بے میم کی ہے

معلوم نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ کے بعد جس طرح تصوف کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خیال بدلا ہے اسی طرح اس عقیدہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی یا ابھی تک "معذورِ صہبائے محبت" ہیں اور خاکِ عرب کے سونے والے کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔

علم وعقیدت کی جنگ

تمام مصلحوں اور پیشواؤں کو سب سے پہلی خطرناک منزل جو پیش آتی ہے وہ علم وعقیدت کی جنگ ہے مصلح دیدۂ تحقیق سے دیکھ کر ڈراتا ہے کہ اے قوم جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اسے پھینک دے کیونکہ زہریلا سانپ ہے مگر رسم پرست قوم کہتی ہے کہ نہیں یہ تازیانہ ہے۔

بوقتِ صبح شود ہمچو روزِ معلومت کہ باکہ باختۂ عشق درشب دیجور

اس جنگ کے ہزار ہا تماشے دنیا دیکھ چکی ہے لیکن ابھی تک بدستور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک شخص علمی تحقیقات سے مفید اور صحیح خیالات قوم کے سامنے پیش کرتا ہے قوم اس کو جاہل، دشمنِ اسلام اور کافر بتاتی ہے۔ امام غزالی، ابنِ رشد، اور امام ابنِ تیمیہ رحمہم اللہ صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کی کتابیں جلائی جاتی ہیں، کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے، کسی کو قید خانے میں جانا پڑتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علمِ یقینی پر ہو، محض رسمی عقیدہ "عیارستان بازارِ تحقیق" میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

تصوف اور اسلام

سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن وحدیث تصوف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ مستشرقینِ یورپ ودیگر محققین جن میں سے کوئی کہتا ہے کہ تصوف فلسفۂ اشراق سے لیا گیا ہے، کوئی اس کا ماخذ کلیساؤں کی رہبانیت کا قرار دیتا ہے۔ ان کی تحقیقات لکھنے کا نہ یہ موقع ہے نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ تاریخ اسلام بھی ہمارے سامنے ہے، اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ابتدا میں جو اہلِ زہد تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے ان کو لوگ صوفی کے نام سے پکارنے لگے۔ یعنی جیسا کہ پیرزادہ صاحب نے فرمایا ہے۔

پیشِ طاقِ صوفیاں احساں بود اتباعِ سنت وقرآں بود

اس زمانہ میں تصوف اخلاص کا نام تھا جس کو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح غزالیؒ وغیرہ ائمہ اسلام نے لکھی ہے۔

لیکن جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دی تو ان کی ہولناک خونریزیوں سے امت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے۔ دنیا کی طرف سے ان کے دل سرد ہو گئے، طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا، حوصلے پست اور ہمتیں سست ہو گئیں۔ زوال وفنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد اور ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا، اور سرمایہ توکل وقناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ وجلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی، بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا۔ کلاہِ نمدی کو

تاج زر پر تیغ کو ترجیح دی گئی اور پکار اٹھے

گوشۂ عافیت و کنج قناعت گنجیست — کہ بشمشیر میسر نہ شود سلطاں را

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہروئے — بہ ازانکہ چترِ شاہی ہمہ عمر ہائے وہوئے

مے دوسالہ و معشوق چاردہ سالہ — ہمیں بس ست مرا صحبتِ صغیر و کبیر

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج ست — کلاہِ دلکش است اما بترکِ سر نمی ارزد

ذوقِ علم طبائع سے یہاں تک مسلوب ہوگیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلہ میں "رہ و رسم پارسائی دور و دراز" نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقہ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی۔ اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں بطے کی جانے لگیں۔ شریعت اور حقیقت دو جداگانہ راستے قرار پائے اور ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی، علماء و فقہا محجوب و بے بصر سمجھے گئے۔ یہ اثرات اگرچہ صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا، اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر ساری ہوگیا۔

زوالِ شوکتِ اسلام

شوکتِ اسلام کے زوال کے اسباب یوں تو پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہوگئے تھے مثلاً سیاست کی خرابی، یعنی وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا ہاتھوں سے جاتی رہی، اور اس کے بجائے استبدادی حکومت قائم ہوگئی، جس نے تمام امت کو غلام بنا دیا۔ مسلمان بے گناہ قتل کر دیئے جاتے تھے۔ ائمہ و علماء جو اپنے زمانے کے روشن چراغ تھے، بیشتر زیرِ عتاب، زیرِ خنجر یا زیرِ طوق و زنجیر رکھے جاتے تھے، اور حق گو زبانیں اس قدر خاموش کر دی گئی تھیں کہ ان مظالم کے خلاف ایک لفظ نہیں نکال سکتی تھیں۔ اس طرح ہر مسلم حریتِ عمل سے محروم کر دیا گیا۔ پھر علمی تقلید جس سے حریتِ فکر بھی جاتی رہی۔ یہ شکنجہ ایسا سخت تھا کہ ایک زمانہ میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ اہلِ علم اس خوف سے کہ کہیں کوئی دشمن ان کے اوپر تہمت لگا کر قتل نہ کرا دے اپنی صحتِ عقیدہ کی سند قاضی سے لیکر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اسلام میں اس بیرونی عنصر کے شمول سے جو جمود پیدا ہوا اس نے بھی بہت کچھ ان اسبابِ زوال کو تقویت دی۔ اور خاص کر ہندوستان میں تو اسلام کی حالت اور بھی خراب ہوئی۔ یہانتک کہ ایک غیر مسلم شخص یعنی قومیت کا مشہور مبصر ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب تمدنِ ہند میں یہاں کے مسلمانوں کی نسبت یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ:-

وہ اسلام جو اس وقت ہند میں رائج ہے اس کی حالت بھی بالکل ویسی ہی ہو گئی ہے جیسے ہند کے اور مذاہب کی۔ اس میں مساوات بھی قائم نہیں جس کی وجہ سے اوائل میں اس کو اس قدر کامیابی ہوئی تھی۔

پھر ایک جگہ لکھتا ہے:

ہندوستان کے اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس مذہب کی یہاں آکر کیسی مٹی خراب ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے رموزِ بیخودی میں موجودہ مسلمانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کچھ بھی شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے۔

مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد — باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بُتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تر است — زانکہ اورا سومنات اندر سر است
رختِ ہستی از عرب برچیدہٗ — در خمستانِ عجم خوابیدہٗ
شل ز برفابِ عجم اعضائے او — سرد تر اشکِ او صہبائے او
ہمچو کافر از اجل ترسندہٗ — سینہ اش فارغ ز قلبِ زندہٗ

قرآن شریف میں نصِ قطعی موجود ہے "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا" پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس سے محروم ہو گئے؟ میرے خیال میں اس کا جواب صرف یہی ہے جو قرآن شریف دیتا ہے: "ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" ڈاکٹر صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست — از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش

معراجِ انسانیت:

پہلی اور واحد کتاب جس میں سیرت الرسول کو قرآن کے آئینہ میں پیش کیا گیا ہے۔

اوقاتِ نماز

(از جناب خواجہ عباد اللہ اختر صاحب، بی اے، جہلم)

میں نے تو اپنے خیال میں صلوٰۃ پر کافی بحث کی تھی لیکن اس شذرہ کے مطالعہ سے جو میرے مقالہ کے ساتھ ہی شائع ہوا ہے (طلوع اسلام مئی سنہ ۱۹۵۰ء) مجھے معلوم ہوا کہ یہ موضوع ابھی تشنۂ تحقیق ہے۔ آخری تبصرہ اگر ضرورت ہوئی تو محترم مدیر کی طرف سے ہی ہوگا۔ لیکن جہاں تک میرے مقالہ سے تعلق ہے تنقید میرا حق ہے۔ یا تو میں اگر حق مجھ پر واضح ہوا اپنی غلطی تسلیم کر لوں گا یا توقع ہے کہ معترضین کرام رجوع الی الحق کریں گے۔

فاضل شذرہ نگار نے اتنا تو ثابت کر دیا کہ صلوٰۃ کے اوقات مقررہ قرآن ہی میں مذکور ہیں اور ان کی تلاش میں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک آپ کے تحت الشعور میں اس ضرورت کا احساس کارفرما ہے۔ اگر اس معہود ذہنی پانچ نمازوں سے علیحدہ ہو کر آیاتِ قرآنی میں تدبر فرماتے تو قرآن خود رہنمائی فرماتا۔

میں نے اپنے مقالہ میں واضح الفاظ میں لکھا کہ ذکرِ الٰہی تو ہر حال میں قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبٍ ہونا چاہیے مگر صلوٰۃ اسی ذکر کی خاص صورت ہے۔ اس کے اوقات مقرر ہیں اور دیگر شرائط وضو وغیرہ کی قید بھی ہے۔ مگر عام ذکرِ الٰہی کے لئے کوئی قید نہیں اور یہ کہ صلوٰۃ جماعتی رنگ میں ہی متصور ہو سکتی ہے۔ فاضل ممدوح نے تسبیح و تحمید کو صلوٰۃ کے ہم معنی خیال کیا جو ان قیود سے آزاد ہیں جن کی پابند صلوٰۃ ہے۔ اس لئے ایسی آیات جن میں صرف تسبیح و تحمید کا مذکور ہے ہماری بحث سے خارج ہیں۔ بحث صرف فرض صلوٰۃ میں ہے مناسب ہے کہ ان آیات کو بھی پھر سے ایک نظر دیکھ لیا جائے جن کا حوالہ فاضل موصوف نے دیا ہے:

وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن آناءي اليل فسبح واطراف النهار لعلك ترضى (۲۰/۱۳۰)

اور اپنے پروردگار کی تسبیح حمد سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے کیا کر اور رات کے کچھ حصہ میں بھی تسبیح کیا کر اور دن کے دونوں کناروں میں بھی ہو سکتا ہے کہ تیری (ذوق و شوق عبادت کی) تسکین ہو۔

وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اليل فسبحه وادبار السجود (۵۰/۳۹)۔

اور اپنے پروردگار کی تسبیح حمد کر سورج نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور رات میں بھی اس کی تسبیح کر اور بعد سجود (نماز تہجد)

دونوں آیات میں سورج نکلنے اور ڈوبنے سے پہلے دن رات کے چوبیس گھنٹے ہیں۔ ان میں کوئی وقت مقررہ نہیں۔ "ومن اللیل فسبحہ" اور "ومن انآئی اللیل فسبح" ہم معنی ہیں۔ اس کی تفسیر "ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم" (۵۲/۴۹) سے بھی ہو سکتی ہے لیکن مفہوم ایک ہی ہے۔ لفظ "ادبار" "وجوہ" کے مقابل استعمال ہوا ہے "یضربون وجوھھم وادبارھم" (۴۷/۲۷)، "ادبر وتولّٰی" (۷۰/۱۷) "من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علٰی ادبارھا" (۴/۴۷) اگرچہ آیہ "والنجم والشجر یسجدان" (۵۵/۶) سے "ادبار النجوم" کی تفسیر ہو سکتی ہے لیکن ان آیات میں مراد نمازِ تہجد ہی ہے جس میں صلوٰۃ کی بعض خصوصیات تو پائی جاتی ہیں مگر نفل ہے۔ ان دو آیات سے صلوٰۃ کا مفہوم پیدا کرنا صحیح نہیں۔ "ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک" ادبار السجود ہی کی تفسیر ہے۔

البتہ تیسری آیت وقیع ہے کہ اس میں لفظ "صلوٰۃ" صراحتاً موجود ہے۔ اور یہی وہ آیت ہے جس سے تین نمازیں اخذ کی جاتی ہیں باقی دو نمازوں ظہر و عصر کے لئے دوسری آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے جو مسلم ہیں۔

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل (۱۷/۷۸)

نماز قائم کر سورج کی ڈھلتی ہوئی روشنی میں جو رات کی تاریکی تک جاتی ہے۔

یہ ترجمہ واضح نہیں لیکن پیشتر اس کے کہ ہم آیاتِ قرآنی سے اس کی تفسیر کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ فاضل ممدوح نے تقلیداً ارشاد فرمایا ہے اس پر بھی غور کر لیں۔ فرماتے ہیں کہ "دلوک" جمع ہے "دلک" کی اور اس کا اطلاق تین یا تین سے زیادہ اعداد پر ہوتا ہے۔ آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ یہ جمع قلت ہے یا کثرت۔ اگر قلت ہے تو نو تک اور اگر کثرت ہے تو لاانتہا نو سے اوپر۔ لیکن معلوم نہیں کہ آپ نے کس قاعدہ کی رو سے "تین" کی تخصیص فرمائی ہے۔ غالباً اس لئے کہ پانچ نمازوں کا تصور پہلے ہی ذہن میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے "صلوٰۃ" جو صیغہ واحد ہے نظر انداز کرتے ہوئے اس کو "دلوک" کے تابع کر دیا ہے۔ "دلوک" نہ تو صیغہ جمع ہے اور نہ قلت یا کثرت کا مفہوم اس سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ بے وزن قیاسی "فُعُول" مصدر لازم، اس لئے تمام بحث جو فاضل ممدوح نے اسے صیغہ جمع تصور کرتے ہوئے فرمائی ہے غلط ہے۔ "صلوٰۃ" صیغہ واحد ہے اور دلوک مصدر لازم، اس لئے یہ وقت ایک ہی نماز کا ہو سکتا ہے اور یہ وقت دوپہر سے رات کی تاریکی تک تو ہو نہیں سکتا جس میں ایک ہی نماز اتنی طویل ہو کہ چھ سات گھنٹوں میں ختم ہو اور معترضین خود بھی اس طویل نماز کے قائل نہیں اس لئے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک ہی نماز کا وقت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ وقت نمازِ ظہر کا ہے یا عصر کا یا مغرب کا؟ "دلوک" کے معنی "ڈھلنا" کئے جاتے ہیں۔ اگر ڈھلنا میں "چھپنا" کا مفہوم بھی شامل ہے جب سورج نمازِ مغرب کے وقت ڈوب جاتا ہے تو ہمیں لفظی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں اور اگر "چھپنا" مفہوم نہیں تو دو ہی نمازیں ظہر و عصر زیرِ بحث رہ جاتی ہیں لیکن معترضین کے لئے مشکل یہ ہے کہ صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء صراحتاً قرآن میں مذکور ہیں لیکن نمازِ شام کے متعلق کوئی آیت نہیں۔ وہ آیت زیرِ بحث ہی سے یہ نماز اخذ کرتے ہیں۔ اگر

نمازِ مغرب کسی اور آیت سے ثابت کرتے ہیں جس کا مجھے علم نہیں تو چونکہ آیت زیر بحث میں ایک ہی صلوٰۃ کا مذکور ہے اس لئے ظہر و عصر سے ایک منتخب کر لیں۔ اس کے ساتھ معترضین کے لئے ایک اور سخت مشکل بھی ہے وہ یہ کہ "اقم" صیغہ امر ہے، پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ امر دوامی ہے یا غیر دوامی اور یہ کہ حرف "لِ" "لدلوک" میں کس معنی استعمال ہوا ہے۔ اس کا استعمال تیس معنوں میں ہوتا ہے "استحقاق، اختصاص، ملکیت، قرب، موافقت، بعد وغیرہم۔ نحوی اس کو موافقت بعد آیہ زیر بحث میں تسلیم کرتے ہیں۔ ہم قارئین کرام کو اس دقیق بحث میں الجھانا پسند نہیں کرتے، ہماری بحث کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ کسی ایک معنی میں لے لیں بہر حال ثابت یہی ہوگا کہ یہ ایک ہی نماز کا وقت مقررہ ہے اور اگر ہم دیگر آیات کو پیش نظر رکھیں تو اس کی تفسیر بھی یہی ہوگی کہ یہ ایک نماز صلوٰۃ الفجر کے مقابل صلوٰۃ العشاء ہے، جس پر ہم اپنے مقالہ میں بحث کر چکے ہیں۔ آیہ زیر بحث "اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل" ہم معنی ہے آیہ "اقم الصلوٰۃ طرفی النھار و زلفاً من اللیل" (۱۱/۱۱۴) کے۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ "شمس" سے مراد صرف قرص خورشید ہی نہیں بلکہ اس کی ضیاء اور حرارت بھی ہے "لا یرون فیھا شمسا و لا زمھریرا" (۷۶/۱۳) "دلوک الشمس" سے مراد خود قرص خورشید نہیں بلکہ "دلوک" ہے جو سورج ہی کی وہ روشنی ہے جب سر شام سورج ڈوب جاتا ہے (جسے انگریزی میں "ٹوائی لائٹ" (Twilight) کہتے ہیں جو دقیقہ بدقیقہ درجہ بدرجہ مدھم پڑتی جاتی ہے اور آخر رات کی تاریکی میں مل کر محو ہو جاتی ہے۔ اسی نسبت سے اس کی حرارت کی کیفیت ہے۔ یہ روشنی پہلے شفق میں سرخ رنگ کی ہوتی ہے پھر سرخی لحظہ بلحظہ زرد پڑتی جاتی ہے، پھر سیاہی مائل سفیدی رہ جاتی ہے اس کے بعد یہ بھی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ مفہوم ہے "دلوک الشمس" کا "دلاک" کہتے ہیں مالش کرنے والے کو اس لئے "دلک" کے معنی فارسی مصدر "مالیدن" اور اردو "ملنا" ہوں گے۔ قرص خورشید سے اس کی حرارت اور روشنی اسی طرح ملیامیٹ ہو جاتی ہے جس طرح مالشی سطحی میل جسم سے اتار دیتا ہے" یہ روشنی جو سورج غروب ہونے کے بعد فضا میں دکھائی دیتی ہے خط استوا سے شمالاً و جنوباً قطبین کی طرف مختلف طول و عرض بلد پر مختلف عرصہ تک رہتی ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا کتنا احسان ہے کہ دونوں نمازوں کے اوقات ایسے مقرر فرمائے ہیں جو خوشگوار ہوتے ہیں تاکہ فرائض کی ادائیگی میں نہ تو دن کے مشاغل میں خلل واقع ہو اور نہ رات کے آرام و آسائش میں، اور کسی وقت کے بھی یہی دونوں اوقات ہیں اور تنگ بھی نہیں۔ رہا سوال التسبیح و تحمید کا تو وہ تو ہر حال میں بلا شرائط ہو سکتی ہے اور تعامل سے پایا جاتا ہے کہ نمازی عموماً نمازوں کے بعد اس کا شغل بھی جاری رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں نے فہم و تفہیم کے لئے کافی بحث کی ہے۔ قارئین حضرات کو آپ بھی کچھ تدبر و تفکر سے کام لینا چاہیئے "تفقہ فی الدین" کا حق تو ہر ایک شخص کو جو اس کا اہل ہے حاصل ہے۔ آخر میں میں محترم مدیر کے لفظوں میں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس تمام بحث کا مقصد یہ نہیں کہ نشہ والوں کو پانچ یا آٹھ نمازوں سے روک دیا جائے۔ نیکی نیکی ہے اگر "عدل" ملحوظ خاطر رہے، اور یہ

منشاء ہے کہ کسی نئے فرقہ کی طرح ڈالی جائے۔ بحث تو صرف اتنی ہے کہ دو نمازیں فرض ہیں باقی سنت جو آنحضرتؐ کے نوافل ہیں۔

برصوم و صلوٰۃ بر سیفرا چیزے　　تعدیل بہرامر کمالِ عرفانست

اگر معترضین نے فرصت دی تو انشاء اللہ ہم قرآنِ عظیم سے زیادہ سے زیادہ مطالب پیش کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ رب زدنی علما۔

خواجہ عباد اللہ صاحب اختر کا تحقیقی مقالہ "الصلوٰۃ" اور قریشی صاحب کا مختصر شذرہ "اوقاتِ نماز" دونوں اپنی جگہ ان کے خیالات کے مطابق درست ہوں گے لیکن ایک محقق کے لئے پوری تسلی و اطمینان اپنے اندر نہیں رکھتے۔ محترم خواجہ صاحب نے بہت سے قابلِ قدر نکات بیان فرمائے ہیں ساتھ ہی بعض باتیں ہم جیسے طالب علموں کے لئے تشریح طلب ہیں۔ خواجہ صاحب نے دو نمازیں ثابت کرنے پر زیادہ زور دیا ہے اور صلوٰۃ الوسطیٰ سے صلوٰۃ الجمعہ مراد لی ہے میرے خیال میں جس طرح درمیانی نماز عصر نہیں اسی طرح صلوٰۃ الجمعہ بھی نہیں کیونکہ صلوٰۃ الجمعہ کے متعلق واضح حکم موجود ہے۔

قصر صلوٰۃ کے حکم سے رکعتوں کا تعین ایسا نہیں جس سے بلا وجہ انکار کیا جاسکے۔ نماز ظہر اور عصر کا بغیر قرأت ادا کرنا واقعی ولا تجہر بصلاتک ولا تخافت بہا۔ (17/110) آیۂ مبارکہ کے مطابق عمل نہیں ہے اور محترم کی یہ دلیل معقول ہے۔

صلوٰۃ الفجر کا حکم قرآن حکیم میں صاف اور واضح طور پر موجود ہے (17/78) نماز ظہر کا کہیں ذکر نہیں اسی آیت میں ظہر کو پہرے کا وقت فرمایا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے "اور اپنے رب کی تسبیح کر حمد کے ساتھ سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے (20/130) اور رات کے وقت بھی تو تسبیح کر اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ تو راضی ہو جائے (20/130) ان آیات میں تسبیح کا حکم ہے۔

سورۂ روم میں فرمایا پس اللہ پاک ہے جس وقت تمہیں شام ہو اور جس وقت تمہیں صبح ہو (30/17) اور اسی کیلئے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں اور عشاء کے وقت اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو (30/18) ان دو آیات میں تسبیح کا حکم نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کا بیان ہے۔ قرآنِ حکیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ اور تسبیح دو الگ الگ ہیں جیسا کہ اس آیۂ مقدسہ سے صاف واضح ہے۔

الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السمٰوٰت والارض والطیر صٰفٰت کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ

واللہ علیم بما یفعلون (24/41)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے لئے ہی تسبیح کرتے ہیں تمام وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پر کھولے ہوئے پرندے۔ ہر ایک اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

دوسری نماز صلوٰۃ الفجر کے بعد دوسری نماز کے لئے یہ حکم ہے۔

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق الیل (17/78)

قائم کر صلوٰۃ کو سورج کے ڈھلنے کے وقت سے رات کے چھا جانے تک۔

لغت میں بھی دلوک الشمس کے معنی سورج کے ڈھلنے سے غروب آفتاب تک ہیں۔ الغسق کے معنی اندھیرا بھی ہیں۔ چاند گرہن کو غسق القمر کہا جاتا ہے جیسے غاسق اذا وقب۔ اندھیرا کرنے والی جب چھا جائے (۱۱۳/۳) اس آیت میں تعین نہیں کہ دلوک الشمس سے غسق الیل تک ایک ہی نماز کا وقت ہے یا زیادہ کا ہے۔ اگر ایک ہی وقت مراد لیا جائے تو یہ دوسری نماز ہوئی اور تیسری نماز صلوٰۃ العشا کا لفظ سورۂ نور کی آیت ۵۸ میں پردے کے حکم میں موجود ہے اس طرح بھی تین اوقات ثابت ہوتے ہیں۔ قوموا للہ قانتین اور اللہ کیلئے مؤدب ہو کر کھڑے ہو جاؤ (۲/۲۳۸)

ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً (۴/۱۰۳)

بلاشبہ مومنین پر صلوٰۃ پابندیٔ وقت فرض ہے۔

صلوٰۃ الوسطیٰ خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ تفسیر بیان للناس میں لکھتے ہیں:

تمام نیک کام جو رضائے الٰہی چاہنے کیلئے کئے جاتے ہیں عبادتیں اور نمازیں ہیں۔ سورت معارج میں ارشاد ہے کہ وہ لوگ جو ملوع و جزوع اور منوع ہوتے ہیں نمازی نہیں ہوتے۔ بلکہ نمازی وہ ہیں جو اپنی نمازوں پر ہمیشگی کرتے ہیں اور نمازی وہ ہیں جن کے مالوں میں سائل و محروم کے لئے حق معلوم ہے اور نمازی وہ ہیں جو روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور نمازی وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر ان کی اپنی آزاد بیوی یا منکوحہ لونڈی میں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے اور نمازی وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی نگہبانی کرنے والے ہیں اور نمازی وہ ہیں جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں اور نمازی ہیں جو اپنی ان نمازوں پر حفاظت کرتے ہیں یہ لوگ جنتوں میں عزت پانے والے ہیں (۷۰/۱۹ تا ۳۵)

سورت ماعون سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز سے بے خبر وہ لوگ ہیں جو ریاکاری کے کام کرتے ہیں اور امداد کی چیزوں کو روکتے ہیں۔ اس قسم کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ تمام نیک کام نمازیں ہیں لیکن ان میں سے ذکرِ الٰہی والی نماز خاص ہے یہ ذکرِ الٰہی والی نماز بے حیائی اور نامعقول سے روکنے والی ہے یہ تمام دیگر نمازوں سے فاضل تر ہے کیا ذکرِ الٰہی تمام چیزوں سے اکبر و اعلیٰ نہیں (۲۹/۴۵) اسی سبب سے خدائے تعالیٰ نے ذکرِ الٰہی والی نماز کو "الصلوٰۃ الوسطیٰ" فرمایا ہے۔ وسطیٰ کے یہ معنی لغات میں موجود ہیں خود قرآن پاک میں بھی اوسطہم فضلہم کے معنوں میں آیا ہے پھر یہ نماز بندوں کو اپنے مالک سے ملا دینے والی ہے۔

دوسرے پارے میں بہت سی اصلاحوں کا ذکر ہے ان میں عورتوں کی حلت کو ادنیٰ سے اعلیٰ بنایا گیا ہے اور نکاح و طلاق کے متعلق نہایت عالی شان ہدایتیں دی گئی ہیں۔ ان ہدایات میں خدا تعالیٰ نے نہایت محبت کے ساتھ ہمیں کئی ایک ایسی اعلیٰ باتیں سکھائی ہیں جنہیں لوگ ان کے ملنے سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ ان پہلے حکموں کی تاکید کی خاطر فرمایا کہ یہ اصلاحیں بھی نمازیں ہیں ان کی حفاظت کرو اور جو نماز خدا تعالیٰ سے ملا دینے کا واسطہ ہے اس کی بھی حفاظت کرو اور مؤدب ہو کر اپنے رب کی طرف توجہ لگاؤ (۲/۲۳۸) ایسی صلوٰۃ وسطیٰ یعنی ذکرِ الٰہی والی نماز کو گنتی کی بحث میں پیش کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ خدا تعالیٰ

ان آیات کے ساتھ ہی فرماتا ہے کہ "میں یہ آیتیں بیان کرتا ہوں تاکہ تم عقل کرو (۲۴/۶۱)" (تفسیر بیان للناس منزل اول ص۳۱)

(داعی الی القرآن)

ماہ مئی گذشتہ کے طلوعِ اسلام میں "اوقاتِ نماز" کے عنوان کے تحت ایک صاحب نے چند آیات کے حوالے سے قرآن حکیم سے پانچ نمازیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ کوئی ایسی نص صریح نہیں پیش کر سکے جس سے پانچ فرض نمازیں ثابت ہوں۔ علمائے حدیث و فقہ کا یہ اعتراض کہ قرآن میں پانچ نمازوں کی تعداد کا ذکر وضاحت سے نہیں اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک غیر قرآنی تعلیمات سے پانچ نمازوں کا تصور اذہان پر مرتسم نہ ہو جائے آیت اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس ... سے پانچ نمازیں ثابت نہیں ہوتیں۔ جو علماء قرآن حکیم کو اصل کتاب دین سمجھتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ تمام غیر قرآنی نقوش و تصورات کو الگ رکھ کر قرآن سے براہِ راست احکامات حاصل کرتے ہیں۔ اس قاعدہ سے خواجہ عباد اللہ اختر صاحب کی تصریحات جو اسی پرچے میں زیر عنوان "الصلوٰۃ" شائع ہوئی ہیں قرآنی نماز کے متعلق صحت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے بغیر تحویل و تاویل کے بدلائل ثابت کیا ہے کہ نمازیں دو ہیں اور اوقات نماز بھی دو ہیں۔

محترم مضمون نگار "اوقاتِ نماز" نے دلوک کی جو لغوی و معنوی تحقیق کی ہے وہ عجیب ہے اور قابلِ قبول نہیں۔ دلوک دلک کی جمع نہیں ہے بلکہ مصدر ہے۔ اگر جمع کا صیغہ بھی مان لیا جائے تو یہ نتیجہ نکالنا کہ سورج افق نور سے دن میں (ظہر سے مغرب تک) تین مرتبہ ڈھلتا ہے علمی دنیا میں متحقق نہیں۔ زمین سورج کے گرد مقررہ رفتار سے گردش کرتی ہے۔ اسی گردش سے لیل و نہار کا ظہور ہوتا ہے۔ ماہرین علم الطبیعیات کے نزدیک ظہر و مغرب کے درمیان سورج کے زوال میں کوئی مراتب ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ علمائے امت ظہر و عصر کا اندازہ سایہ سے کرتے ہیں۔

مفسرین نے لدلوک الشمس الی غسق اللیل سے ظہر، عصر، مغرب و عشاء چار نمازوں کے لئے عام اعتقاد کو نظر میں رکھ کر دلیل پیدا کی ہے۔ اگر قرآن کے الفاظ پر غور کیا جائے تو صرف ایک نماز کا وقت نکلتا ہے۔ زوالِ آفتاب سے رات کے اندھیرے تک اس نماز کا وقت ہے، چونکہ اتنی لمبی ایک نماز غیر فطری چیز ہوئی اس لئے اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ اس طویل وقت میں جب آسانی دیکھو نماز ادا کر لو۔

مناسب ہوگا اگر مفسرین کے اقوال درج کر دیئے جائیں۔

(۱) لدلوک ای من وقت زوالھا الی غسق اللیل اقبال ظلمتہ ای الظہر والعصر والمغرب والعشاء (جلالین)

سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک یعنی چار نمازیں ظہر، عصر، مغرب و عشاء۔

(۲) قوله لدلوك الشمس الخ اصل هذه المادة يدل على التحول والانتقال ومنه الدلك فان الدالك لا تستقر يده ومنه دلوك الشمس ففي الزوال انتقال من وسط السماء الى ما يده وفي المصباح دلكت الشئ دلكا من باب قتل مرسته بيدك ودلكت النعل بالارض مسحتها بها ودلكت الشمس والنجوم دلوكا من باب قعد زالت عن الاستواء ويستعمل في الغروب ايضا وفي الكمالين روى ابن مردويه بسند ضعيف عن ابن عمر مرفوعا دلوك الشمس زوالها ولكنه في الموطأ موقوفا بسند صحيح وهو المأثور عن ابن عباس وجابر وهو قول الحسن وعطاء وقتادة وروى ابن حاتم عن علي دلوكها غروبها وكذا روى عن ابن مسعود وهو قول النخعي والضحاك ومقاتل والسدى قال البغوي ومعنى اللفظ يجمعهما لان اصل الدلوك الميل والشمس يميل اذا زالت او غربت والحمل على الزوال اولى لكثرة القائلين به ولانا اذا جمعنا عليه كانت الآية جامعة لمواقيت الصلوٰة وعلى الثاني يخرج الظهر والعصر (تعليقات جديده من التفاسير المعتبرة على جلالين)

مفسرین کے نزدیک دلوک کے معنی میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مراد ہے زوال آفتاب کا آسمان کے وسط سے۔ حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، جابرؓ اور حسنؒ، عطاؒ، قتادہؒ وغیرہ صحابہ و تابعین اسی کے قائل ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دلوک بمعنی غروب ہے۔ بعضے صحابہ و تابعین حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، نخعیؒ، ضحاکؒ، مقاتلؒ، سدیؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ پہلے معنی پر یہ وقت چار نمازوں پر شامل ہے اور ثانی پر نماز مغرب اور عشاء پر۔ اور جمع بین الصلوٰتین بھی اسی حصہ آیت سے نکالتے ہیں۔

اگر طرفی نہار کے ساتھ زلفاً من اللیل کی تخصیص کا لحاظ رکھا جائے تو ظہر اور عصر کا وقت خارج ہو جاتا ہے۔

نماز مغرب (یا عشاء) کے لئے وقت کی وسعت سہولت پیدا کرتی ہے اور اس لئے رحمت ہے۔ آج کے بدلے ہوئے تمدن میں انسان کے لئے کام کا وقت دن کے اوقات پر منحصر نہیں رہا۔ شام کا وقت ہمارے معاشرہ میں بعض اعمال و اشغال کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ سیر و تفریح، ورزش، مجالس ایسے ضروری اشغال اب زندگی کا لازمہ بن گئے ہیں۔ نماز مغرب (شب) کے وقت میں وسعت ان اشغال میں حارج نہیں ہوتی۔

بشیر احمد ندویؒ جالندھری

قرآن اور مسئلہ جبر و قدر

(جناب عرشی - دار القرآن - لاہور)

مئی ۱۹۵۸ء کے طلوعِ اسلام میں ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کے مضمون "اقبال اور مسئلہ جبر و قدر" نے گویا مجھے سوتے سے جگا دیا۔ آپ نے اس پر اپنے تعارفی نوٹ میں امید دلائی ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب "اس موضوع پر طلوعِ اسلام کے لئے ایک تفصیلی مقالہ سپردِ قلم فرمائیں گے"۔ اس سے مجھے اور بھی خوشی ہوئی۔ اللہ کرے ڈاکٹر صاحب اہلِ شوق کو طویل انتظار کی زحمت سے بچا کر اپنے اس وعدے کو جلدی ہی لباسِ عمل پہنائیں۔

اس مضمون کے مطالعے سے واضح ہوا کہ ۱۹۲۸ء سے پہلے مغرب کی علمی دنیا نیوٹن کے نظریۂ "مجبریت و مشینیت" کی قائل تھی۔ علامہ اقبال کے مدراس والے لکچر اس سے پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ اس کے بعد مادہ، توانائی اور علت و معلول کے تصورات میں یکسر انقلاب آگیا۔ اس انقلاب کا سہرا آئن سٹائن اور ہائزن برگ کے سر ہے۔ ایک نے مادہ اور توانائی کی دوئی اور غیریت کو ختم کیا اور دوسرے نے جبریت اور مشینیت کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔

حضرت علامہ مرحوم کو اس قدیم اور بظاہر لاینحل بحث میں الجھنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اس مسئلہ کو طے کئے بغیر دینی اوامر و نواہی اور نتائجِ اعمال کی اہمیت و افادیت متصور نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایک مشین جس کی حرکات پہلے سے متعین ہیں وہ اپنی کسی حرکت کے متعلق نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہے اور نہ اس پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

علمی دنیا ہزار چکر لگانے کے بعد آج جس اصول "غیر تعینیت" پر پہنچ رہی ہے، قرآن کے طالب علم کو (بشرطیکہ وہ ملا زدہ اور صوفی گزیدہ نہ ہو) اپنے مطالعۂ قرآن کے روزِ اول ہی سے یہ حقیقت کسی ایچ پیچ کے بغیر قرآن کے ہر ہر صفحے پر بکھری ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے اور اس سے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ جو آج ہائزن برگ کی فکر رسا سے ظاہر ہو رہی ہے۔ کاش ان کے سامنے قرآن روایتی غلافوں کے بغیر اپنی اصلی شان میں جلوہ گر ہوتا تو وہ اس کی سماویت اور قدوسیت کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ——— میں نے اس وقت قلم اس لئے اٹھایا ہے کہ اس موضوع پر جو آیات میری نظر میں ہیں ان میں سے بعض قارئین طلوعِ اسلام اور بالخصوص ڈاکٹر صاحب محترم کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ اپنے مبسوط مقالے کی تیاری میں انھیں پیشِ نظر رکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ موصوف کی نگاہ پہلے سے ان پر ہو، لیکن حسن ایسی چیز نہیں کہ اسے دوبارہ دیکھنے سے کوئی آنکھ اکتاہٹ محسوس کرے۔۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

(۱)۔ یاایھاالذین اٰمنوا لیبلونکم ..... لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب (مائدہ ۹۴)

مسلمانو! اللہ پاک تمہیں آزمائیں گے ..... تاکہ اللہ پاک جان لیں کہ کون ان سے غائبانہ ڈرتا ہے۔

اس آیت میں زور "لیبلونکم" اور "لیعلم" پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ آزمائیں گے ..... تاکہ جان لیں ـــــ اس سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی اعمال پہلے سے متعین نہیں ـــــ یہی طرز بیان بار بار اختیار فرمایا ہے۔

(۲)۔ وتلک الایام نداولھا بین الناس ولیعلم اللہ الذین اٰمنوا۔ (آل عمران ۱۳۹)

لوگوں میں تغیرات زمانی اس لئے آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیں۔

(۳)۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصٰبرین (۱۴۱)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے مجاہدوں کو نہیں جانا اور نہ ہی صابروں کو جانا۔

(۴)۔ ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم (توبہ ۱۶)

کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے مجاہدوں کو نہیں جانا۔

اگر اعمال پہلے سے متعین ہوتے تو یقیناً جان لیا ہوتا۔ یہ نہ جاننا صراحتہً عدم تعیین کا اعلان ہے، اور یہی روح ادیان ہے۔

(۵)۔ وما اصابکم یوم التقی الجمعان فباذن اللہ ولیعلم المومنین ولیعلم الذین نافقوا۔ (آل عمران ۱۶۷)

دو گروہوں کے مقابلے کے دن تمہیں جو تکلیف پہنچی وہ اللہ کے اذن سے تھی اور تاکہ اللہ مومنوں کو جان لیں اور ان لوگوں کو بھی جان لیں جو نفاق پیشہ ہیں۔

(میں اپنی طرف سے کوئی حاشیہ آرائی نہیں کرتا سیدھا سادہ ترجمہ کرتا ہوں جو عام مترجموں نے کیا ہے۔)

(۶)۔ وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب (حدید ۲۵)

ہم نے لوہا اتارا اس میں شدت کی سختی ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ جان لیں کہ کون اُن کا اور ان کے رسولوں کا مددگار رہتا ہے۔

(۷)۔ نبلونکم حتی نعلم المجاھدین منکم (محمد ۳۲)

ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ ان لوگوں کو جان لیں جو تم میں سے مجاہد ہیں۔

(۸)۔ ولنبلونکم بشیءٍ من الخوف والجوع الخ۔ (بقرہ ۱۵۶)

ہم تمہیں خوف اور بھوک وغیرہ مصائب سے آزماتے رہیں گے۔

(۹) — لیبلونی ءاشکر امر اکفر ۔ (نمل — ۴۰)

(قولِ سلیمانؑ) اللہ نے مجھے نوازا تاکہ مجھے آزمائیں کہ میں قدردان ثابت ہوتا ہوں یا ناشکرا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر بھی زیر امتحان ہوتے ہیں۔

موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں:

(۱۰) — اذھب الی فرعون . . . . ، فقل ھل لک الیٰ ان تزکیٰ ۔ (نازعات - ۱۷)

جا فرعون کی طرف! . . . . اور اسے کہدے کہ کیا تو پاک ہونا چاہتا ہے؟

اگر پہلے سے اس کی شقاوت متعین ہے تو یہ ارسالِ رسالت (معاذ اللہ) ایسا ہی عبث ٹھہرتا ہے جیسا کوئی ببول کو مخاطب کر کے کہے کہ تو بیری بن جا!

یہاں تک تو انسان کا تعلق تھا اب ہم غیر انسانی کائنات یا آغاز تخلیق کے متعلق قرآنی بیان دیکھتے ہیں۔ یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا موضوع ہدایت انسان ہے، اس کے سوا کچھ نہیں — اس کے علاوہ جتنے مباحث آئیں گے وہ ضمنی ہوں گے، اسی موضوع کی تائید و وضاحت کے لئے — لیکن ٹوہ لگانے والے انہی اجمالی اشارات سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

قرآن دائمی قانون ہے۔ اس نے بدلتے رہنے والے لفظ کہیں استعمال نہیں کئے، مادہ، ذرات لاتیجزی، سالمات، برقیے، لہریں، توانائی، ایٹم وغیرہ کے متعلق انسانی تحقیق تغیر و ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی — قرآن کسی جگہ "شے" اور کسی مقام پر "کل" اور کہیں "امر و خلق" کے جامع الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ الفاظ ہمیشہ ہی اپنی معنویت کے اعتبار سے غیر متغیر اور کائنات کے ہر جزو پر حاوی رہیں گے۔

میں یہاں آیات، ترجمہ آیات اور مختصر اشارات ہی پیش کر سکوں گا — آدم و مسیح (علیہما السلام) کی تخلیق کے متعلق فرماتے ہیں:۔

(۱) — خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون — (آل عمران ۶۰)

یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کر کے (اللہ تعالیٰ) کہتے ہیں "ہوجا" پھر وہ استمراراً ہوتا جاتا ہے۔

یہاں مٹی سے پیدا کرنے کے بعد "کن" کہا گیا ہے۔

(۲) — اذا قضی امراً فانما یقول له کن فیکون ۔ (بقرہ ۱۱۸)

اللہ جب کسی کام کے متعلق حکم یا فیصلہ فرماتے ہیں تو اسے کہتے ہیں "ہوجا" پھر وہ ہوجاتا ہے۔

(یا ہوتا جاتا ہے)

(۳)۔۔ خلق السماوات والارض بالحق ویوم یقول کن فیکون ۔ (انعام ۷۳)

اللہ ہی نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور اس دن (یعنی زمان) کو (بھی پیدا کیا) جب کہ (کسی شے کے سامان کی) فرماتے ہیں "ہوجا" تو (وہ شے) موجود ہوجاتی ہے۔

(۴)۔۔ انما قولنا لشئ اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون ۔ (نحل ۴۰)

جب ہم کسی شے (کو وجود میں لانے) کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کیلئے ہمارا کہنا یہی ہوتا ہے "ہوجا" پھر وہ (وجود پذیر) ہوجاتی ہے۔

(۵)۔۔ انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون (یٰسین ۸۲)

جب اللہ کسی شے کو (خلعتِ وجود بخشنا) چاہتے ہیں تو اسے فرماتے ہیں "ہوجا" پھر وہ (ان کے چاہنے کے مطابق) ہوجاتی ہے۔

ان آیتوں نے "کن" کے دائرہ عمل کی وسعتیں بیان فرمائیں ۔۔۔ آدم (انسان)، آسمان، زمین، ہر امر اور ہر شے "کن" کے زیرِ اثر وجود میں آتی اور ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہتی ہے ۔۔۔ "کن" صرف ازل میں کسی خاص وقت ایک ہی مرتبہ نہیں کیا گیا بلکہ ہر لمحہ اس کا اثر و نفوذ جاری و ساری رہتا ہے، اور خود لمحات (زمان) کی تخلیق بھی "کن" ہی سے ہوتی ہے۔ "شئ" کا اطلاق مادہ و توانائی، ذرہ و برقیہ، زمان و مکان وغیرہ سب پر یکساں ہوتا ہے ۔۔۔ "کن" کا معمول انسان ہو یا امر یا شئ ہر جگہ "یکون" کہہ کر اس کی استمراری فاعلیت ظاہر کی گئی ہے ۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کن فیکون" کی سطح پر ہر چیز ایک طرح کی بنیادی مساوات لئے ہوئے ابھرتی ہے ۔۔۔ اب ہم آغازِ خلقت سے آگے بڑھتے ہیں:

(۱)۔۔ لہ ما فی السماوات والارض کل لہ قانتون ۔ (بقرہ ۱۱۶)

(۲)۔۔ لہ من فی السماوات " " " " (روم ۲۶)

(مشترکہ ترجمہ آیتین) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ اور جو کوئی بھی ہے سب اللہ ہی کی ملک ہیں اور انہی کے تابع ہیں۔

یہاں بھی "ما" اور "من" یعنی انسان اور تمام غیر انسانی مخلوق کو قنوت (فرمانبرداری) کی ایک ہی لائن میں کھڑا کیا گیا ہے۔

(۳)۔۔ ربنا الذی اعطیٰ کل شئ خلقہ ثم ھدیٰ ۔ (طٰہٰ ۔ ۵۰)

ہمارے پروردگار وہ ہیں جو ہر شے کو اس کی خلقت بخشتے ہیں۔ پھر (ہر شے کو) ہدایت (بھی) دیتے ہیں۔

"شے" کے معنی دیکھ لیجئے ۔۔۔ انسان، زمان، مکان، مادہ اور توانائی سب ادھر ہی سے وجود اور ہدایت حاصل کرکے اپنی اپنی راہ چل پڑتے ہیں۔

(۴)۔۔ انطقنا اللہ الذی انطق کل شئ (حم ۔ ۲۱)

ہر شے کو نطق بخشنے والے نے ہمیں نطق کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔

یہ آیت پارہ عالم آخرت کے ایک مکالمے سے لیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کو اس کے مناسب حال نطق ملتا ہے۔ اور بھی کئی آیتیں اس مفہوم کی موید ہیں جن سے آسمان، زمین، جبال وغیرہ کی طرف قول، انکار، خوف اور بکا کو منسوب کیا گیا ہے ۔۔۔ زمین و آسمان کو حرکت و گردش کا حکم ملتا ہے کہ چلے آؤ طوعاً یا کرہاً۔

(۵) ـــــ قالتا اتینا طائعین

دونوں جواب دیتے ہیں کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔

اس آیت نے دو باتیں بتائیں۔ اول ارض و سما کا "قول"، دوم کرہ (مجبوری) کے خلاف اپنی مرضی سے تعمیل حکم کے لئے چل پڑنا۔ طوع کے معنی ہیں مرضی سے، بغیر جبر کے، بخوشی "غیر تعینیت"[۱] یا اختیار[۲] کا اس سے زیادہ واضح ثبوت اور کیا ہو گا۔

زمین، آسمان اور پہاڑوں کے سامنے بار امانت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے، چاہیں تو اٹھا لیں ورنہ انکار کر دیں۔

(۶) ـــــ فابین ان یحملنہا واشفقن منہا (احزاب ۷۲)

وہ اس کے اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں (انکار کی وجہ یہ ہے کہ وہ) اس سے خائف ہو جاتے ہیں۔

اینٹ، پتھر، مٹی کا جو تصور ہمارے ذہن میں ہے اس میں انکار اور خوف کی گنجائش کہاں ہے۔

(۷) ـــــ لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ (حشر ۲۱)

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم اسے خدا کے ڈر سے عاجزی کرتے اور پھٹتے ہوئے دیکھ لیتے۔

یہاں بھی "خشیت و خشوع" اختیار کی دہائی دے رہے ہیں۔ معاف فرمائیے میں اپنے رب کے کلام کو شاعری نہیں سمجھتا اور نہ ہی ایسا سمجھنے کی اجازت ہے ـــــ قوم فرعون کی عبرتناک تباہی کے بعد فرماتے ہیں:

(۸) ـــ فما بکت علیھم السماء والارض - (دخان - ۳۰)

زمین و آسمان ان کی بربادی پر نہ روئے۔

احتیاط دیکھئے "السماء" فرمایا ہے، سماوات نہیں کہہ دیا۔ یعنی وہ خاص خطہ ارض اور یہی حصہ سما جس سے وہ لوگ وابستہ تھے۔

(۹) ـــــ تسبح لہ السماوات السبع والارض ومن فیھن - (بنی اسرائیل ۴۵)

اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے۔

ارض و سماوات کا تسبیح بیان کرنا تو نص سے ثابت ہو گیا لیکن "من" (جو کوئی) سے خیال ہو سکتا ہے کہ باقی غیر ذوی العقول اس سے

---

[۱] [۲] ہمارے الفاظ بیان حقائق سے قاصر ہیں "غیر تعینیت" یا "اختیار" محض اشارہ ہیں اس حقیقت و واقعیت کی طرف جس کا بیان ہو رہا ہے۔

خارج ہیں، اس لئے اسی آیت کے متصلہ حصے میں بالکل ہی پردہ اٹھا دیا ہے:

(۱۰) — وان من شی الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (بنی اسرائیل ۴۵)

اور کوئی چیز نہیں جو نہیں پڑھتی خوبیاں اس کی لیکن تم نہیں سمجھتے پڑھنا ان کا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اس آیت کے حاشیہ کی ایک سطر دیکھئے:

.... لیکن تم اسے نہیں سمجھتے خواہ فکر و تامل نہ کرنے کی وجہ سے یا اس قوت کے فقدان کی وجہ سے جس کے ذریعہ بعض مخلوقات کی تسبیح قابل سنی اور سمجھی جا سکتی ہے۔

زیر خط الفاظ غور طلب ہیں — جب ہم قرآنی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے اور آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں ایک عجیب و غریب مقام نظر آتا ہے، ممکن ہے کہ نباتات میں احساس و شعور کو تحقیق کرنے والا سائنس چند سو یا ہزار سال بعد سفر کر کے وہاں تک پہنچ جائے۔

(۱۱) — کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ،

ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی بندگی اور یاد۔ (ترجمہ شیخ الہند)

یہاں تین لفظ ہیں جن سے "کل" کو متصف فرمایا ہے (۱) علم (۲) صلوٰۃ (۳) تسبیح — صلوٰۃ و تسبیح کی وسعتیں قرآن پاک سے بیان کی جائیں تو ع

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لئے

لیکن ہم اوپر کی آیات کو ملا کر جس کھلے ہوئے نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ اتنا تو ضرور ہے کہ

(۱) — ہر شے امر کن کی تعمیل کر رہی ہے، وہ مادہ ہو یا توانائی یا کچھ اور۔

(۲) — ہر شے اور ہر شخص فرمانِ الٰہی کی پیروی کر رہا ہے اگرچہ ہر ایک کی پیروی کا دائرہ جداگانہ ہے۔

(۳) — ہر شے کو وجود کے ساتھ ہدایت بھی ملتی ہے تاکہ وہ اس پر کاربند ہو کر آگے بڑھ سکے۔

(۴) — ہر شے کو اس کے مناسب حال نطق بھی ملتا ہے۔

(۵) — ہر شے حمد و تسبیح کی مکلف بنائی ہے۔

(۶) — اور یہ تسبیح و حمد گراموفون کے ریکارڈ کی طرح نہیں کہ بولتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ کیا بولتا ہے۔ بلکہ سب کو اپنی اپنی صلوٰۃ و تسبیح کا علم بھی ہے۔

آج سے قریباً تیس برس پہلے جب دنیا نے آئن سٹائن اور ہائزن برگ کا نام بھی نہیں سنا تھا قرآن پاک میرے کان میں کہہ رہا تھا کہ کائنات کے کسی ذرے کا مقام و رفتار پہلے سے متعین نہیں، سب کے ان کے مناسب حال اختیار دیا گیا، جس کے تحت وہ مختلف

عناصر کی صورتیں حاصل کرتے ہیں ــــ ایک ذرہ جو نائٹروجن بنا، ہائیڈروجن کیوں نہیں بنا؟ اس کی وجہ اس کا وہ فعل ہے جو اس نے ایسا بننے سے پہلے انجام دیا ــــ یہ الگ بات ہے کہ وہ ابتدائی اختیار (علم، صلوٰۃ وتسبیح) ہمارے نزدیک کتنا ہی مبہم (لاتفقہون) ہو ــــ خود مختلف انسانی مدارج کے اختلاف اختیار کو دیکھیں تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔ ایک ان پڑھ دیہاتی ایک فلسفی کے دائرۂ اختیار میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ ایک بہرہ اور گونگا انسان تانسین کے ملکوتی لحن کی لطافتوں کو اپنی بلندئ پرواز کے باوجود چھو نہیں سکتا۔ ایک غرقِ فسق نوجوان تزکیۂ نفس اور محبتِ الٰہی کے فردوس کا تصور بھی نہیں کر سکتا ــــ ہم جو بلحاظ انسانیت ایک سطح پر ہیں، آپس میں اتنے مختلف ہیں تو موالید ثلاثہ اور ظرف و زمان کے اختلافِ احوال میں کتنا کچھ بُعد ہوگا۔ اس کو خالق تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے؟

یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ انسانی ہو یا غیر انسانی، ہر اختیار و فعلیت کے حدود ہیں اور پھر ان حدود کے اندر بھی تصرفِ حقیقی کی کارفرمائیاں قرآن اور مشاہدے سے ثابت ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے ــــ ایک شخص کے ہاتھ میں رسی کا ایک سرا ہے، دوسرے سرے سے اس نے ایک بچے کا پاؤں باندھ رکھا ہے اور وہ رسی بیس گز لانبی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بندھا ہوا بچہ بیس گز سے آگے نہیں جا سکتا اور اس بیس گز کے اندر دائیں بائیں، آگے پیچھے جدھر چاہے جائے۔ پھر بھی جس کے ہاتھ میں سرا ہے، وہ اس کو اس کی محدود گردش کے اندر جب چاہے رسی کھینچ کر سکیڑ دے اور جب چاہے ڈھیلا کر دے۔ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ دائیں طرف جاؤ گے تو انعام پاؤ گے بائیں جانب مڑو گے تو سزا ملے گی۔ اس نے پہلے سے اس کا کسی طرف جانا متعین نہیں کیا۔ یہی مطلب ہے من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر ــــ کا (جو چاہے مانے اور جو چاہے انکار کر دے)۔

اگر ہم اللہ کے تصرف کو درمیان سے الگ کر دیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ انسان کو ذی اختیار ثابت کرتے کرتے ہم اختیار کے خالق و معطی کو مشین بنا دیں گے جو نہ عقلاً صحیح ہے اور نہ نقلاً۔

اس موضوع پر میرا اور علامہ اقبال مرحوم کا ایک مکالمہ یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا: میں نے عرض کیا "مولانا روم نے فرمایا ہے:

نطق آب و نطقِ باد و نطقِ گِل ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

اس سے کیا مراد ہے؟" آپ (علامہ) نے فرمایا "قرآن مجید میں ہے، زمین و آسمان کی ہر چیز تسبیح کرتی ہے اور کل قد علم صلوٰتہ وتسبیحہ (ہر مخلوق کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم حاصل ہے۔ ان آیتوں سے ثابت ہے کہ ہر شے کو اس کے حال کے مطابق نطق عطا ہوا ہے"۔

میں نے کہا "مجھے نطقِ اشیاء عناصر سے انکار نہیں میرا سوال "محسوسِ حواسِ اہلِ دل" پر ہے۔ آپ (علامہ) کی پیش کرد

دوسری آیت کے ساتھ ہی یہ لفظ پڑے ہوئے ہیں، ولکن لا تفقھون (یعنی ہر شے نمازی اور تسبیح خواں تو ضرور ہے لیکن اے انسانو! تم اس کی سمجھ نہیں رکھتے) پھر اہلِ دل اس تعلق کو کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ آپ (علامہ) نے یہ شعر پڑھا:

ہر کہ عاشق گشت حسنِ ذات را — گشت سید جملہ موجودات را

آپ کی حالت متغیر ہوگئی، آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں خاموش ہوگیا۔" (ملفوظات ص ۴۳ و ۴۴)

آخر میں حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر متذکرہ صدر آیات کے تفصیلی معانی تک پہنچ چکی تھی ـــ فرماتے ہیں

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند — با من و تو مردہ، با حق زندہ اند
آب و باد و خاک و نار پُر شرر — بے خبر با ما و با حق با خبر
جملہ اجزائے جہاں پیشِ عوام — مردہ و پیش خدا دانا و رام

ان دعاوی کا ثبوت بھی دیتے ہیں:

گر نبودے واقف از حق جانِ باد — فرق چوں می کرد اندر قوم عاد؟
گر نبودے نیل را آں نور دید — از چہ قبطی راز سبطی می گزید؟
خاک قاروں را چو فرماں در رسید — با زر و تختش بقعر خود کشید
نور موسیٰ دید و موسیٰ را نواخت — خسف قاروں کرد و قاروں را شناخت
ایں زمیں را گر نبودے چشمِ جاں — از چہ قاروں را فرو برد آں چناں

جذبِ یزداں با اثرہا و سبب
صد سخن گوید نہاں در زیرِ لب

سکھر میں طلوع اسلام

کا

تازہ پرچہ

کیانی بک ڈپو، اسٹیشن روڈ، سے طلب کیجئے۔

نقد و نظر

منشورِ اقوامِ متحدہ، دیگر بین الاقوامی دساتیر و دستاویزات

کہنے کو تو اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور حامیانِ اردو کے ان جذبات کو دیکھا جائے جو وقتاً فوقتاً نثر و نظم کے لباس میں اردو کی تائید میں سامنے آتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو سے زیادہ پیاری زبان شاید ہی روئے زمین پر کوئی اور ہو۔ یہ جذبات اپنی جگہ درست، لیکن جب اس پیاری زبان کا دامن ٹٹولا جاتا ہے تو سوائے ان سطحی قصائد مدحیہ کے اور کچھ دستیاب نہیں ہوتا۔ عہدِ حاضر کی ترقیات نے انسانی معاشرت کو بہت وسیع بنا دیا ہے۔ زندہ قوموں کی زندہ زبانیں قدم بہ قدم ان وسعتوں کا ساتھ دے رہی ہیں اور عملی قدر تناسب ان کا دامن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اردو بیچاری ہے، کہ جس کی مدحت کے گیت گائے جاتے ہیں مگر اس کے دامن کو پھیلانے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں ہوتی۔

پاکستان کو وجود میں آئے تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ آزاد مملکت کی حیثیت سے پاکستان اقوامِ متحدہ اور دیگر متعدد بین الاقوامی اداروں کا رکن ہے۔ ان اداروں کی رکنیت اور ان کی کارگذاری میں شرکت کی وجہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ہیئت اور ان کے قواعد و ضوابط کو سمجھنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کی یہی صورت ہے کہ متعلقہ دستاویزات کو اردو میں منتقل کیا جائے اور مرکزی طور پر ان کی اشاعت کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ اس طرح نہ محض اردو ادب میں ایک اہم خلا پورا ہو جائے گا بلکہ اردو زبان بین الاقوامی عناصر و قویٰ کی حامل ہو کر زندگی و حرکت کی نئی تڑپ محسوس کرنے لگ جائے گی۔ تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ حکومت نے اس طرف توجہ نہیں دی حالانکہ یہ کام صرف حکومت کے کرنے کا تھا۔ حکومت کے نہ کرنے کی صورت میں یہ ذمہ داری ایک حد تک ان اداروں پر عائد ہوتی تھی جو اردو کی خدمت کا دم بھرتے ہیں۔ حیرت بالائے حیرت یہ کہ اس اہم فریضہ کی بجا آوری کا خیال آیا تو مرحوم حیدر آباد کے ایک سابق وکیل کو۔ احمد عبداللہ المسدوسی کا طویل تجربۂ وکالت اور قانونی جذب و انہماک ہی اس طاقت شکار منزل کی جانب عناں کش ہو سکتا تھا، ورنہ یہ کام نہ ایک شخص کا ہے اور نہ ایک نوخیز اور گمنام ادارے کا، عام اس سے ان کے عزائم کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں۔ جناب المسدوسی کی ہمت اور عرق ریزی قابلِ تحسین ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مترجم نے منشورِ اقوامِ متحدہ، میثاقِ مجلسِ اقوام، دستور العمل بین الاقوامی عدالتِ انصاف، منشورِ اطلانٹک

بین الاقوامی بنک، بین الاقوامی ادارۂ صحت کے دساتیر وغیرہ، بین الاقوامی دستاویزات کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ دستاویزات ایسی ہیں جن کا آئے دن اخبارات میں چرچا ہوتا ہے، لہٰذا ان کا ترجمہ نہ محض مدیران اخبارات کے لئے ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے بلکہ سنجیدہ قارئین اخبارات کے لئے بھی خصوصی افادیت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ان دستاویزات کا مطالعہ بین الاقوامی سیاست کے ہر مبصر کے لئے ضروری اور مفید ہے۔

بین الاقوامی قانونی اور آئینی دستاویزات کا اردو میں ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ایسی دستاویزات کے ترجمے کے لئے ایسی اصطلاحات کی ضرورت ہے جس کی حدود اور معانی متعین ہوں۔ اردو کا دامن ایسی اصطلاحات سے بہت حد تک خالی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں کس قدر کاوش اور عرق ریزی کی ضرورت ہے۔ کسی ادبی تحریر کے ترجمے میں جو آسانیاں ہوتی ہیں وہ قانونی اور آئینی دستاویزات میں میسر نہیں آسکتیں کیونکہ قانونی ثقاہت ادبیت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اندریں حالات اردو مترجم کے لئے دوہری مشکل ہے۔ بہرحال احمد عبداللہ المسدوسی صاحب نے ان ہمت شکن مشکلات اور صبر آزما موانعات کے باوصف ترجمہ کی وادی کو طے کیا ہے۔ ان کی ہمت اور عرق ریزی قابلِ تحسین ہے۔ انہی کے الفاظ میں:

> اس کتاب کا ترجمہ خشک، کہیں کہیں مغلق اور نامانوس نظر آئے گا، لیکن ترجمہ کی سلاست، شگفتگی اور ادبیت کے مقابلہ میں اس کو جان بوجھ کر گوارہ کرنا پڑا ہے۔

چونکہ جیسا کہ لکھا گیا ہے اردو میں انگریزی کی طرح معین اصطلاحات کی کمی ہے، اس لئے مناسب ہوتا کہ اردو تراجم کے مقابل میں انگریزی اصطلاحات بھی درج کر دی جاتیں۔ اس سے نہ محض اصطلاحات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی بلکہ انھیں عام طور پر رائج کرنے میں مدد ملتی۔ ایسے الفاظ تو نہیں تو کتاب کے آخر میں علیحدہ فہرست کی شکل میں بھی دیئے جا سکتے ہیں۔

ہم اس کوشش کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور ان حضرات سے جنھیں اپنے کاروبار میں ایسی دستاویزات کی ضرورت پڑتی ہے التماس کرتے ہیں کہ وہ اس کوشش کی قدر و اہمیت پہچانیں۔

قیمت چھ روپے (غیر مجلد) اور سات روپے (مجلد) ہے۔ ضخامت ۴۷۹ صفحات ہے اور مکتبہ خدام ملت اے۔ ایم۔ ۴ فریر روڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے اور اچھا سفید کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

---

۲) کارنامۂ اسلام رسالہ ہمایوں، لاہور کے سابق مدیر اور ترکی میں پاکستان موجودہ سفیر میاں بشیر احمد صاحب کے ذوقِ سلیم اور علمی متانت سے کون واقف نہیں۔ ان کا نام نامی ہی کسی کتاب کے حق میں سب سے بڑی سفارش ہے۔ زیرِ نظر کتاب یعنی 'کارنامہ اسلام' میں میاں صاحب نے مسلمانوں کی پوری تاریخ پر طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور اسے نہایت

اختصار مگر جامعیت سے کوئی سوا دو سو صفحات میں سمو دیا ہے۔ ایک رنگین نقشے میں میاں صاحب نے بڑی محنت سے ہر اس ملک کا نام دیا ہے جس پر مسلمانوں نے کبھی حکومت کی اور اس کے تحت ان خاندانوں کے نام ہیں جو مختلف زمانوں میں وہاں حکمران رہے۔ اس نقشے میں عیسوی اور ہجری سن بھی دیئے گئے ہیں۔ ایک باب میں اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو مختصراً سن وار درج کیا گیا ہے۔ ان دلچسپیوں کے علاوہ متفرق ممالک میں مسلمانوں کی آبادی کے اعداد و شمار، اسلامی ہند میں بیداری اور تشکیل پاکستان کی جدوجہد نیز قائداعظم کی داستانِ حیات جیسے دلچسپ اور پُر از معلومات ابواب بھی اس کتاب میں ملیں گے۔ عمومی اعتبار سے "کارنامۂ اسلام" مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق موزوں کتاب حوالہ کا کام دے سکتی ہے۔

کتابت اور طباعت عمدہ۔ مجلد کتاب کی قیمت ساڑھے تین روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ ہمایوں، لاہور۔

---

(۲) شباب سے پہلے

یورپ میں بڑے آدمیوں کے سوانح نگار ان کے حالاتِ بچپن کو خصوصیت سے پیش کرتے ہیں تاکہ نفسیاتی طور پر جائزہ لیا جا سکے کہ عہدِ طفلی کے مخصوص حالات و کوائف یا عناصر و عوامل نے ان کی تعمیرِ سیرت میں کیا حصہ لیا۔ یا یہ کہ ان کی بڑائی کے آثار کس حد تک بچپن میں نمایاں تھے۔ یورپ میں واقعی بڑے آدمی بنتے ہیں اور جب علمی نقطۂ نگاہ سے ان کے بچپن کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان میں کافی علمی مواد مل جاتا ہے۔ اس طرح وہ کوشش بجائے خود علم کی اہم خدمت ہو جاتی ہے۔ اردو میں بھی "ادب" کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور محرابِ ادب، کراچی نے "بڑوں کا بچپن" "خود ان کے قلم سے" مرتب کر کے "شباب سے پہلے" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ کوئی پونے چار سو صفحات کی اس کتاب میں چھتیس کے قریب حضرات کے طفلانہ سوانح حیات ہیں۔ ہر چند کتاب "بڑے آدمیوں کے حالات بچپن" سے متعلق ہے لیکن جن حضرات کے حالات شائع ہوئے ہیں وہ سب کے سب بڑے نہیں ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ کے مطابق:

> "اس کتاب میں بعض ایسے احباب کے مضامین بھی ہیں جو شاہیر کی صف میں ابھی نہیں پہنچے ہیں، لیکن یہ فال نیک شاید کام آجائے اور وہ مستقبل قریب میں بڑے آدمی بن جائیں۔"

گویا جو حضرات بڑے آدمیوں کی صف میں ہنوز نہیں پہنچے وہ اس کتاب میں حالات درج کرا دینے سے بڑے بن سکتے ہیں۔ کتنا آسان نسخہ ہے! "بعض احباب" کے حالات اور اندازِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے فی الواقعہ اس فال نیک کو غنیمت جان کر اس نسخہ کو آزمایا ہے۔ مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں:

> ایک دوست (یعنی جناب ناشر) کے اصرار کو ٹال جانا میرے بس کی بات نہیں۔ . . . (ورنہ) میں مشہور و معروف شخص نہیں . . . . جتنا سوچتا ہوں پریشان ہوتا ہوں . . . . بہر حال تعمیل ارشاد کرتا ہوں . . . .

اس مجموعہ میں جو حالات پیش کئے گئے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں کہ نہ ان کا کوئی نفسیاتی فائدہ ہے اور نہ ان کی ادبی حیثیت ہے۔ یہ مجموعہ حصۂ اوّل ہے۔ حصہ دوم زیر طبع ہے اور "سیاستِ حاضرہ کے پیش رو حضرات کے مناقب زندگی" کا رہینِ منت ہوگا۔ مجلد کتاب کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔

۴) کتاب الحج حج اسلام کا عظیم الشان بین الاقوامی اجتماع ہے جس کی حکمت مسلمانوں نے اسلام کو دین کی بجائے مذہب بنا کر ضائع کر دی ہے۔ اب یہ زندگی بخش "رکن" دین رسمی طور پر محض "ثواب" کی خاطر ہی ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ باوجودیکہ مسلمانانِ عالم "ذوق وشوق" سے "فریضہ" حج ادا کرتے ہیں، ان کی ملی زندگی میں نہ کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے نہ سیرت میں انقلاب آتا ہے۔ جب حکمت نظروں سے اوجھل ہو جائے تو سارا زور ظاہری رسوم پر ہی صرف ہوتا ہے جن کی حیثیت جسدِ بے روح سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ ان سے کوئی مطلوبہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

بہرکیف رسمِ حج کی ادائیگی کے لئے بہت سی معلومات کی ضرورت ہے۔ ایسی کتابیں شائع ہوتی ہی رہتی ہیں جن کا مقصد عازمینِ حج کی راہنمائی ہوتا ہے، لیکن یہ کتابیں عموماً معلومات کے اعتبار سے جامع نہیں ہوتیں اور کتابت اور طباعت کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لٹریچر میں امسال مفید اضافہ پیشِ نظر "کتاب الحج" سے ہوا ہے۔ یہ کتاب عبدالحمید خانصاحب نے مرتب کی ہے۔ اس میں "سفرِ حج کے لئے گھر کے روانہ ہونے کے وقت سے تا تکمیل حج و زیارت روضۂ اطہر ہر مرحلے کی دعائیں" بمعہ ترجمہ درج ہیں۔ نیز جا بجا مقدس مقامات کے نقشے بھی دیئے گئے ہیں تاکہ رسوم کی ادائیگی کے طریقے بآسانی سمجھ میں آجائیں۔ مرتب خود بھی دو مرتبہ حج کر چکے ہیں اور وہ حاجیوں کی عملی مشکلات کو جانتے ہیں۔ کتاب کی ترتیب میں انھوں نے اس تجربے سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ کتاب اچھے سفید کاغذ پر دیدہ زیب چھپی ہے۔ کتاب کے ظاہری محاسن کے لئے تو فیروز سنز کا نام سند ہے جو اس کے ناشر ہیں۔

عازمینِ حج اس کتاب کو راہنما بنا کر بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔ کتاب مجلد ہے اور ضخامت ۱۷۶ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:

فیروز سنز

۴۰ مال روڈ، لاہور ۳۵ مال روڈ پشاور میکلوڈ روڈ کراچی

۵) تاریخ مثنویاتِ اردو زندہ زبانوں کے لئے "تاریخ ادب" کی ترتیب ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن اردو کا دامن جہاں اور بہت سے ضروری لٹریچر سے خالی ہے، وہاں تاریخ ادب کی بھی نمایاں طور پر کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ کی طرف ایک حد تک توجہ ضرور دی گئی ہے مگر تاریخ کی ترتیب کے لئے جس ذوقِ تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہوتی ہے اس کا مظاہرہ کم ہوا ہے۔ جب عمومی تاریخ سے اس قدر بے اعتنائی برتی گئی ہو تو مختلف اصنافِ ادب کا علمی مطالعہ اور جائزہ خارج از بحث ہے۔ اب تک اس ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر ان طلباء کے لئے لکھا گیا ہے جنھیں بعض اردو امتحانات کی تیاری کے لئے "درسی" کتاب کی احتیاج ہوتی ہے۔ عام درسی کتب کی طرح یہ ادبی کتابیں بھی طالب علمانہ ذوق کی تسکین کی خاطر نہیں بلکہ کاروباری نقطۂ نظر سے لکھی گئیں۔ چنانچہ

کتابوں کا معیار بلند ہو سکا اور نہ طلبہ میں ہی علمی طلب پیدا ہو سکی کہ وہی معیاری کتب کی متقاضی ہوتی۔

"تاریخ مثنویات اردو" تالیف ہے "الحاج مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی" کی۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اردو مثنویوں سے متعلق ہے۔ دیباچہ نگار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مصنف "شعر الہند" کے الفاظ میں:

اس صنف سے متعلق تاریخی اور ادبی حیثیت سے جو ذخیرہ متفرق طور پر موجود تھا ان کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے

. . اور یہ تبصرہ جن کتابوں سے ماخوذ ہے دیانتداری سے ان کے نام لکھ دیئے گئے ہیں۔

خود مولف کے الفاظ میں:

جن مثنویوں کا انتخاب یہاں لکھا جائے گا اس میں ابتداً مصنف کے ضروری مگر مختصر حالات لکھے جائیں گے اور اس کے بعد مثنوی پر جن ارباب قلم اور اہل فن کے تبصرے لکھے ہیں ان کا خلاصہ درج کیا جائے گا۔ اور آخر میں اگر کوئی بات قابل اختلاف یا لائق اطلاع ہوگی تو مزید توضیح مؤلف کی طرف سے کر دی جائے گی۔ ورنہ انہیں آراء پر اس انتخاب کو ختم کر دیا جائے گا۔

کسی مولف کی یہ انتخابی کوشش ظاہر ہے طلبہ کی امتحانی ضرورت تو شاید پوری کر سکے، ادبی لٹریچر میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ اردو بہرحال ابھی عہد طفولیت میں ہے اور اس کے مطالعہ کی کوششیں بھی زیادہ معیاری نہیں ہوں گی۔ البتہ اگر یہ ابتدائی کوششیں زیادہ تحقیقی طالبانِ علم کے لئے تازیانہ ثابت ہو سکیں اور انھیں اپنے فریضہ کی ادائیگی پر آمادہ کر سکیں تو ایسی کوششیں از جہت سبقت ہی سہی یقیناً قابلِ تحسین ہوں گی۔

اردو امتحانات کی تیاری کے لئے یہ مفید امدادی کتاب ہے۔

ہمارے پیشِ نظر کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ کتاب مجلد ہے اور ضخامت ۲۲۰ صفحات ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ قیمت تین روپے۔

ناشر: شرکتِ مصنفین لاہور۔ مقامی طور پر اردو کتاب گھر۔ پریڈی سٹریٹ نزد امپریس مارکیٹ صدر کراچی ۳ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

(بقیہ لمعات از صفحہ ۸)

یہ ہیں چند مثالیں ان لوگوں کی دیانت کی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی زندگی اسلام کی معیاری زندگی ہے اور پیدائشی مسلمانوں کو ان کے ہاتھ پر تجدیدِ ایمان کرنی چاہئے۔ اگر صرف پاکستان کی تائید اور مخالفت کے معیار پر ہی دیکھا جائے تو ان لوگوں سے زیادہ اپنے قول کے پکے تو وہ نیشنلسٹ مسلمان ہیں جو پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور آج بھی ہندوستان ہی میں ہندی قوم کے افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی پاکستان کے مسلمانوں کو وہ فریب نہیں دے سکتے جو جماعتِ اسلامی کے یہ نقاب پوش ناصحین مشفق دے رہے ہیں۔ اسی لئے تو قرآن، مفاد پرستوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جگہ دیتا ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ بتایا ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کس حد تک دیانت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اب دوسری چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ وہ جس اسلامی نظام کے قیام کی مدعی ہے وہ نظام ہے کیا؟ طلوعِ اسلام کے صفحات میں یہ حقیقت متعدد بار دہرائی جا چکی ہے کہ ہمارا موجودہ مذہب جو ظنیات کے آسرے پر قائم ہے۔ ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح شخصی اجارہ داریوں کو قائم رکھا جائے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ شخصی اجارہ داریاں قائم نہیں رہ سکتیں تاوقتیکہ انھیں اربابِ مذہب کی تائید حاصل نہ ہو۔ جس طرح روما کے قیصر کے لئے پوپ کی ضرورت تھی اور ہندوستانی راجاؤں کیلئے برہمنوں کی، اسی طرح مسلمان بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں، اور سرمایہ داروں کے لئے محراب و منبر سے تائید کی ضرورت تھی۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ آج جبکہ ساری دنیا رفتہ رفتہ زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، ملوکیت کی لعنت کو جسدِ انسانیت سے الگ کر چکی ہے یا کرنے کیلئے کوشاں ہے۔ ملوکیت اپنے تمام استبداد و قہرمانیت کے ساتھ اگر کہیں مسلط ہے تو مسلمانوں کے ملکوں میں۔ پاکستان کی مملکت نئی نئی وجود میں آئی ہے۔ لہذا یہاں توقع کی جاسکتی ہے کہ ملوکیت کی لعنت اس پر مسلط نہیں ہوگی۔ لیکن جماعتِ اسلامی ایک عجیب فریب انگیز انداز میں شخصی اجارہ داریوں کی لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے کے درپے ہے۔ بظاہر دیکھئے تو ملاازم کے دشمن لیکن ذرا نقاب سرکا کر جھانکئے تو وہی ملوکیت کے قائم کرنے والے متشدد ملا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم قدامت پرست ملا نہیں بلکہ ماڈرن لیڈر ہیں، انھوں نے انگریزی کے چند الفاظ یاد کر رکھے ہیں اور موقع بے موقع انھیں کو دہراتے رہتے ہیں۔ ملوکیت کی لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے میں ان کی دو اغراض پوشیدہ ہیں۔ ایک

تو یہ کہ اس میں ان کا ذاتی فائدہ ہے کہ جو جماعت شخصی اجارہ داریوں کو قائم رکھے گی شخصی اجارہ داری بہرحال اس کا معاوضہ دے گی۔ اور دوسرے یہ کہ پاکستان کے قیام اور تشکیل کے خلاف جو جذباتِ مخالفت ان کے سینے میں دس سال تک موجزن رہے ہیں وہ انھیں آج بھی رہ رہ کر اکسا رہے ہیں کہ پاکستان کو ایک ایسی مملکت نہ بننے دیا جائے جس سے یہ دنیا میں سر اونچا کر کے چل سکے۔ یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ پاکستان بھی افغانستان، عرب، ایران وغیرہ کی طرح ملاؤں کے قبضہ میں جکڑا رہے اور اس طرح دنیا کی زندہ قوموں کے رحم و کرم پر اپنی زندگی کے دن گذارے۔ قرآن ہر قسم کی شخصی اجارہ داری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک برہنہ شمشیر تھا۔ اس نے دنیا میں سب سے پہلے ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کا محکوم تھا اور نہ محتاج۔ زمین اور اس کے تمام خزانے، آسمان اور اس کی تمام برکتیں، بالفاظِ دیگر خدا کی ربوبیتِ عامہ کے تمام وسائل اور ذرائع ہر انسان کیلئے یکساں طور پر کھلے تھے، جن سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کر سکے اور اس طرح نوعِ انسانی شرفِ انسانیت کے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اقطار السمٰوات والارض سے بھی بلند ہو جائے کہ یہی قرآن کا مقصود اور اسلامی نظام سے مفہوم تھا۔ لیکن ملوکیت کی اجارہ داریوں نے مذہبی آسروں کی بدولت وسائل و ذرائعِ ربوبیت کو پھر سے شخصی ملکیتوں میں لے لیا اور اس طرح رزق کے سرچشمہ پر قابض ہو کر دوسرے انسانوں کو اپنی ہوسناکیوں کا آلۂ کار بننے پر مجبور کر دیا (یاد رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت ہی نہیں، اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ ہر وہ نظام جو رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت میں دیدیتا ہے یا ایسے نظامِ زندگی کی حمایت کرتا ہے نظام ملوکیت کے دائرہ میں شامل ہے، خواہ وہ فغفور و خاقاں ہو یا گاؤں کا بسوہ دار یا ان کی حمایت کرنے والا) پاکستان میں قرآنی نظام کے نفاذ کا مطالبہ اسی مقصود کو لئے ہوئے ہے کہ اللہ نے جب ہمیں یہ امکانی قوت عطا کی ہے کہ ہم اس سرزمین میں جس قسم کا معاشرتی نظام چاہیں قائم کر لیں تو یہاں وہی نظامِ ربوبیت قائم ہونا چاہیے جس میں انسانیت نہ اجارہ داروں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو اور نہ ان کی حمایتیوں کی تسبیحوں کے تاگوں میں پڑی ہوئی۔ یہ نظام ہر قسم کے سرمایہ دار اور اس کے حمایتی کیلئے پیغامِ موت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار یا تو بلاواسطہ اس کی علانیہ مخالفت کر رہے ہیں اور یا بالواسطہ مخالفت کیلئے اپنے حمایتی ڈھونڈ رہے ہیں۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے بدنام ہو چکی تھی اس لئے وہ بھی اس تلاش میں تھی کہ انھیں حصولِ مدارج کیلئے کہیں سے تقویت کا سامان مل جائے۔ یہی وہ تقاضے ہوتے ہیں جہاں ملوکیت اور ملائیت میں سمجھوتا ہوا کرتا ہے۔ آنے والے انتخابات نے اس کیلئے اور بھی فضا سازگار کر دی اور یہ سمجھوتا عمل میں آگیا۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی جاگیرداری اور زمینداری کو عین کتاب و سنت کے مطابق ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اور اس کا نام رکھ رہی ہے احیائے دین اور قانونِ شریعت کا نفاذ

اے محمد گر قیامت را برآری سر ز خاک ‌ ‌ ‌ سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے آپ کو یہ جماعت سرمایہ داری اور جامد مذہبیت کی مخالف قرار دیتی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی نظر بندی کے سلسلہ میں ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ء کے اشارات میں ارشاد ہوتا ہے کہ

> خدا کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کا علم جب بھی کسی بندۂ حق نے اٹھایا ہے تو اس کا راستہ روکنے کیلئے حکومت، سرمایہ داری اور جامد مذہبیت کی مختلف طاقتیں دوش بدوش کھڑی ہو گئی ہیں۔

کتنا بڑا ہے یہ فریب جو بھولے بھالے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ وجوہات جن کی بنا پر طلوعِ اسلام، جماعتِ اسلامی کے مسلک کی مخالفت کرتا ہے۔ ہم اس باب میں صرف اتنا گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ مخالفت اور موافقت کے تمام تاثرات سے الگ ہٹ کر ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے جو سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں اور اس کے بعد سوچئے کہ کیا کوئی ایسا مسلمان جو مفاد پرستی کے جذبات سے الگ ہو کر اپنا لائحہ عمل قرآن کی روشنی میں متعین کرنا چاہتا ہو کسی صورت میں بھی جماعتِ اسلامی کے مسلک کی تائید کر سکتا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اربابِ اقتدار اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زندگیوں میں جماعتِ اسلامی کو اپنے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کیلئے بہت سا مسالہ ملتا ہے۔ طلوعِ اسلام خود ان لوگوں کی نہج زندگی کے خلاف سرتاپا صدائے احتجاج ہے۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم موجودہ بساط کی جگہ جو نئی بساط بچھانا چاہتے ہیں وہ کیسی ہے۔ طلوعِ اسلام خالص قرآنی نظامِ ربوبیت کے نفاذ کا مدعی ہے۔ جماعتِ اسلامی اس کے برعکس شخصی اجارہ داری اور اس اجارہ داری سے وابستہ عیش پرستیوں کیلئے شرعی جواز[1] کی سندیں مہیا کرنے اور انسان کی فکری صلاحیتوں کو معطل کر دینے والی ملائیت کے نظام کو مسلط کر دینے کیلئے کوشاں ہے۔ اور اس کا نام انھوں نے رکھا ہے نظامِ اسلامی اور قانونِ شریعت۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اس نظام کو اسلام سے کیا واسطہ ہے اور طلوعِ اسلام کس طرح اس نظام، اور اسے اسلامی کہہ کر پیش کرنے والوں کی حمایت کر سکتا ہے۔

---

[1] جماعتِ اسلامی غلامی کو عین شریعت کے مطابق بتاتی ہے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام میں مودودی صاحب کا وہ مضمون شائع ہو چکا ہے جس میں انھوں نے جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر بلا قیدِ تعداد، امراء کے محلات میں داخل کرنے کو شریعتِ حقہ کے تقاضوں میں سے بتایا تھا اور ملوکیت کی اس ہوس پرستانہ لعنت کو اسلام کے لئے وجہِ فخر قرار دیا تھا!

حکومتِ حق

اللہ اللہ اقتدارِ روزہ دار — جبر کر رکھا ہے خود پر اختیار
قلب پر خوفِ خدا طاری کیا — نفس پر فرمانِ حق جاری کیا
حکمِ حق کا اس قدر پابند ہے — صبح ہی سے کھانا پینا بند ہے
ترک دن بھر کو ہوا آب و طعام — نعمتیں جو تھیں حلال اب ہیں حرام
ایک لقمہ پیٹ میں ڈالا نہیں — جب کوئی بھی دیکھنے والا نہیں
محتسب کا اور نہ قاضی کا ہے ڈر — ہے فقط فرمانِ حق پیشِ نظر
یہ خود اپنے آپ پر دانستہ جبر — اور پھر اس پر یہ استقلال و صبر
وجہ اس ہمت کی ہو سکتی ہے کیا — قوتِ ایمان و تقوے کے سوا

ہے جہاں اک بھی مسلماں کا وجود
ہے وہاں حق کی حکومت کی نمود

فرد کے مانند ملت بھی اگر — نظم و ضبطِ شرع سے ہو بہرہ ور
دین کے آئین کی پابند ہو — اس کی ہر مشکل میں بھی خورسند ہو
صبر و تقوے میں ہو مثلِ روزہ دار — اس کا جبر آئینہ دارِ اختیار
سعیِ تلبیسِ حق و باطل نہ ہو — مصلحت کوشی پہ یوں مائل نہ ہو
ملک میں قانونِ حق جاری کرے — اور محمدؐ سے وفاداری کرے
جو علمبردار ہو اسلام کی — ایسی ملت ہو امام اقوام کی
فیض پھر ہو جائے عام اسلام کا — پھر سے قائم ہو نظام اسلام کا
دینِ پیغمبرؐ ہو پوری شان پر — غالب آئے اور سب ادیان پر

ڈر نہ ہو بالکل کسی فرعون کا
ہو نمونہ انتم الاعلون کا

اسد ملتانی

رفتارِ عالم

مشرقِ وسطیٰ

یوں تو مشرقِ وسطیٰ بوجہ اپنی خصوصی اہمیت دولِ عظمیٰ کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ چلی آرہی ہے، لیکن اب خصوصیت سے یہ بدقسمت علاقہ دولِ عظمیٰ کی کشمکش کا شکار ہو رہا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں لارنس، میکموہن اور بالفور نے عربی دنیا میں سازش اور نفاق کا جو تخم خبیث بویا اور جسے غدارانِ عرب شریف حسین اور اس کے بیٹے عبداللہ نے خونِ عرب سے سینچا، اس کی ایک شاخ سلطنتِ ہاشمی کی صورت میں، عراق کے علاوہ دریائے اردن کے مشرقی کنارے سے پھوٹی اور دوسری کوئی چوتھائی صدی سے اوپر عرصہ میں دریائے اردن کے مغربی کنارے سے یہودی حکومت کی صورت میں پھوٹی۔ دونوں انگریز کے خود کاشتہ پودے ہیں اور دونوں کا ماحصل فردوسی کے الفاظ میں "میوۂ تلخ" کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نقشہ پر دیکھنے سے مشرقِ وسطیٰ کی اہمیت کا بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ علاقہ ایشیا اور یورپ کو ملاتا ہے لہٰذا دونوں کیلئے بہترین دفاعی خط کا کام دے سکتا ہے۔ قازم، سویز اور روم، اس کے چند نمایاں اہمیت کے نقاط ہیں۔ بین الاقوامی مواصلات کی شاہراہ یہی ہے، اور جنگ کی سب سے اہم ضرورت یعنی تیل کے گراں بہا ذخائر بھی اسی علاقہ میں ملتے ہیں۔ مشرق اور مغرب میں امریکہ اور برطانیہ کو روس کے مقابلہ میں جو پسپائیاں حاصل ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کے پیشِ نظر ان کی نگاہ میں مشرقِ وسطیٰ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ آخر کہیں تو مضبوطی سے قدم جمائیں گے اور بزعمِ خود ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ممالکِ عربیہ برطانیہ اور فرانس کے حلقہ ہائے اثر میں چلے گئے۔ لیکن بتدریج یہ اثر کم ہوتا گیا اور دوسری جنگِ عظیم میں جب فرانس نقشۂ عالم سے نتا نظر آیا تو شام اور لبنان اس کے پنجۂ اقتدار سے نکل گئے۔ برطانیہ کے پنجے عربی شاہ رگ میں کہیں مضبوطی سے پیوست تھے اس کا معتمد عبداللہ شرق اردن میں موجود تھا۔ پہلی جنگ میں مشترک عربی مفاد سے غداری کا صلہ عبداللہ کو شرق اردن کی شکل میں ملا جو مالی لحاظ سے انگریز کی سالانہ خیرات پر چل رہا ہے اور جس کی فوجوں کی تربیت و کمان انگریز گلب (پاشا) کے سپرد ہے۔

دوسری جنگ کے بعد جب امریکہ کو اپنی عالمگیر سیادت کی ضرورت و اہمیت کا احساس ہوا تو اس نے برطانیہ سے سازش کر کے فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کرا دی۔ اب عالمِ عرب میں دو اڈے قائم ہو گئے۔ ایک عبداللہ دوسرا یہودی۔ یہودی اڈے کے قیام کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ انگریز مصر سے بے دخل ہوا جا رہا تھا اور مصر اور برطانیہ کے معاہدہ (۱۹۳۶ء) پر نظرِ ثانی کے مطالبہ کے ساتھ مصر نہر سویز کے علاقہ سے برطانوی افواج کے اخراج پر بھی زور دے رہا تھا۔ بظاہر برطانیہ کے لئے یہ دشوار ہوتا جا رہا تھا کہ وہ مصر کی مخالفت کے علی الرغم تادیر اپنی افواج کو سویزی علاقہ میں رکھ سکے۔

سویز کی متوقع بے دخلی سے فلسطین کی اہمیت اور بڑھ گئی لیکن اختتام میعاد انتداب کی وجہ سے اسے فلسطین سے بھی نکلنا تھا۔ یہ بے دخلی ازحد ناگوار تھی۔ فلسطین کی بے دخلی کو اردن اور اسرائیل نے پورا کیا، اور "روسی خطرہ" نے سویز کے اخلاء کو معرض التواء میں ڈالنے کا "معقول" بہانہ مہیا کر دیا۔ فلسطین میں اسرائیلی حکومت کا قیام تو ہو گیا لیکن امریکہ نے جس سینہ زوری سے اسے قائم کرایا اور برطانیہ نے جس منافقانہ انداز میں امریکہ کی اس سازش کا ساتھ دیا، اس کے پیش نظر عرب رائے عامہ امریکہ اور برطانیہ کے خلاف ہو گئی۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ حیفہ میں تیل کی پالش گاہیں بند ہو گئیں، کیونکہ حیفہ یہودی حدود میں آگیا اور عراق نے یہودی علاقے میں تیل بھیجنا بند کر دیا۔ تیل کے اتنے اہم ذخیرہ سے محرومی امریکہ اور برطانیہ کے لئے کاری زخم ہے۔ برطانیہ نے سر توڑ کوشش کی کہ عراق پھر سے تیل کی رسد بھیجنا شروع کر دے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ عراق نے اس انکار کے ساتھ ساتھ یہ تجویز پیش کی کہ اگر تیل کی پالش گاہیں حیفہ کی بجائے عربی علاقے میں منتقل کر دی جائیں تو تیل پھر سے مہیا کیا جا سکتا ہے۔

فلسطین کا جو عربی علاقہ بحر روم تک جاتا ہے وہ مصر کے قبضہ میں ہے۔ مصر برطانیہ کا معتمد نہیں۔ لہٰذا تیل کی لائن کو ایسے غیر معتمد علاقہ میں بھی نہیں پہنچایا جا سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ عبداللہ ساحل روم تک پہنچ جائے؟ اس کی سلطنت بالکل مختصر سی ہے اور وہ دوسری سلطنتوں میں گھرا ہوا ہے، اس کی رسائی براہ راست بحر روم تک نہیں۔ لیکن اگر وہ اس وقت سمندر سے دور ہے تو اسے آہستہ آہستہ سمندر تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ عبداللہ سمندر تک پہنچ جائے تو اس کا رقبہ سلطنت بھی وسیع ہو جائیگا اور اس کی تجارتی راہیں بھی کشادہ ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کا قدم اول الحاق فلسطین عربی ہوا۔ یہ الحاق جس سے عبداللہ کی سلطنت باعتبار رقبہ دگنی ہو گئی ہے امر اتفاقی نہیں۔ بلکہ اب عربی مصر جنگ فلسطین کے کوائف و حالات کو جو پیچھے مڑ کر دیکھ رہے ہیں تو ان کے شکوک بڑھتے جا رہے ہیں کہ جنگ کے دوران میں عبداللہ کے گلب پاشا اور گلب پاشا کے عرب لیجن نے یہودیوں سے "تعاون" کرتے ہوئے ایک طے شدہ منصوبہ کے مطابق "فتوحات" حاصل کیں۔ یروشلم کے نئے شہر پر یہودی قبضہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بیان کی جاتی ہے۔ اتفاق سے جنوبی فلسطین پر مصر قابض ہو گیا اور عبداللہ کا سمندری راستہ مسدود ہو گیا۔ اب کوشش ہو رہی ہے کہ غزہ کو مصری قبضہ سے نکلوا لیا جائے تاکہ عبداللہ اس عربی فلسطین کو بھی اردن سے ملحق کر سکے اور بحر روم کے ساحل تک پہنچ جائے۔

پہلی جنگ عظیم میں باپ اور بیٹوں کی مجموعی غداریوں کا صلہ نجد و حجاز، عراق اور شرقی اردن کی ہاشمی سلطنتوں کی شکل میں ملا تھا۔ بعد میں ابن سعود کی یلغار نے ہاشمی سلطنت کا خواب بڑی حد تک پریشان کر دیا تھا۔ عبداللہ اسے کبھی فراموش نہ کر سکا اور وہ ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہا کہ کسی طرح وہ اپنی سلطنت کو مصر اور حجاز کے لگے کا بنا لے۔ شام کلاں کا تصور اسی ہوس توسیع کا پیدا کردہ ہے۔ اتفاق سے یہ بیل ابھی منڈھے نہیں چڑھ سکی۔ مصر خصوصیت سے مزاحم رہا کیونکہ

ایسے حریف کی طاقت میں اضافہ اس کے لئے مستقل خطرہ تھا، اب توسیع کا رخ فلسطین کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ ایک تیر بیک وقت دو نشانوں پر بیٹھے گا۔ عبداللہ کی ہوسِ توسیع کی تسکین بھی ہو جائے گی اور تیل کی پائپ لائن بھی معتمد حلقہ بگوش کے علاقہ میں پورے اطمینان سے منتقل کی جا سکیں گی۔

مشرقِ وسطیٰ میں تفریق اور نفاق و نفرت کے کانٹے بکھیرے گئے تو امریکہ اور برطانیہ کے اپنے پاؤں بھی ان سے فگار ہوئے۔ عربی دنیا میں ان کے خلاف بدظنی اور بداعتمادی کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ روس اور امریکہ کے بلاکوں کی کشمکش جو نوعیت اختیار کر چکی ہے اس کے پیشِ نظر کسی علاقہ میں انگلستانی امریکی ساکھ کم ہونے کا لازماً مطلب یہ ہے کہ اسی تناسب سے روس کی ساکھ زیادہ ہو جائے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے ایسے آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ بعض عرب قائدین لندن اور واشنگٹن کی بجائے ماسکو کی طرف آنکھیں لگائے نظر آتے ہیں۔ خود کردہ را علاج نیست لیکن یہ تبدیلی نگاہ امریکہ اور انگلستان کے لئے پریشان کن ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس رجحانِ خیال کو روکنے کا کونسا حربہ ہے؟ عربوں کی تالیفِ قلوب خارج از بحث ہے کہ تالیفِ قلوب کی ساعی تبدیلی قلب و نگاہ کو مستلزم ہیں۔ استعماری بلاک سے ایسی توقع عبث ہے۔ دولِ عظمیٰ کے پاس واحد حربہ وہی ہے جو ان کی "عظمت" کا باعث ہے یعنی قوت، خواہ اس کا مظاہرہ تباہ کن اسلحہ کی فراوانی کی اعلانیہ نمائش سے ہو، خواہ درپردہ سازشوں سے۔ درپردہ سازشیں تو جمعیت اقوامِ متحدہ کے سٹیج پر پردے بدل بدل کر عرصہ سے جاری ہیں۔ ان کی تقویت کے لئے بہرحال قوت کی رعب انگیزی کی ضرورت ہے جسے عام آدمی کی اصطلاح میں بین الاقوامی قزاقی کہا جا سکتا ہے۔

ضمناً یہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ مغربی بلاک کی ضرورت یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں انتشار نہ ہو اور اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے۔ کیونکہ کسی قسم کی بدامنی ان کے مفاد کے خلاف ہے۔ یہ انتشار کیسے دور ہو اور اتحاد کی صورت کیسے پیدا ہو؟ عرب لیگ ممالک عربیہ کو ایک مشترک سٹیج پر جمع کر رہی ہے، لیکن خدشہ یہ ہے کہ یہ اشتراک و اتحاد امریکہ و انگلستان کے مفاد کے منافی ہو جائے گا لہٰذا اس محنت سے پیدا کئے ہوئے اتحاد کو جو حالات کی رو کا منطقی نتیجہ ہے، کالعدم کر دیا جائے اور اپنے تصور کا اتحاد پیدا کیا جائے جو بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔

عربوں کو فلسطین کے ضمن میں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ امریکہ نے یہودیوں کو تو اسلحۂ جنگ مہیا کئے لیکن عربوں کو مطلوبہ رسد نہیں پہنچائی۔ یہ شکایت ایک گوشہ سے اس بڑی شکایت کا جو فلسطین میں تسلطِ اسرائیل سے پیدا ہوئی۔ لیکن امریکہ حقیقی علت کو چھوڑ کر علامت کا دفعیہ کر رہا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں امریکہ کے وزیرِ خارجہ ڈین ایچسن نے روس کو انتباہ کیا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ سے دست کش ہو جائے۔ روس مشرقِ وسطیٰ میں کیوں دخیل ہوتا ہے؟ اسے ڈر ہے کہ وہ دخیل نہ ہوا تو

اس کا حریف امریکہ دخیل ہو جائے گا۔ امریکہ روس کو کیوں بے دخل کرنا چاہتا ہے؟ تاکہ وہ خود دخیل ہو سکے۔ کمزور اقوام اس گرداب سیاست میں پھنسی ہوئی ہیں جہاں اسباب و نتائج میں تمیز نہیں رہی۔ ایجنس کا انتباہ پیش خیمہ تھا ایک اہم تر اقدام کا۔ اس اقدام کا خاکہ مئی کے اواخر میں پیش کیا گیا، جبکہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے ایک مشترکہ اعلان میں یہودیوں اور عربوں کو اسلحہ فراہم کرنے کا فیصلہ نشر کیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی:

> تینوں طاقتوں (امریکہ، برطانیہ اور فرانس) کو اگر یقین ہو گیا کہ ان میں سے (یہود و عرب) کوئی کسی ملک کی سرحدات یا متارکہ کی حدود کو توڑنے کی تیاری کر رہا ہے تو یہ (تینوں) ممالک اقوامِ متحدہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اس خلاف ورزی کو روکنے کیلئے اقدام کریں گے۔ یہ اقدام اقوامِ متحدہ کے حدود کے اندر اور باہر دونوں طرح کیا جائے گا۔

گویا ممالکِ عربیہ میں جو بدامنی کے آثار ہیں اور جو نتیجہ ہیں اسرائیلی حکومت کے قیام کا، ان کا علاج یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت کو بیش از بیش اسلحہ مہیا کر کے اس قدر مضبوط کر دیا جائے کہ ممالک عربیہ ڈر کے مارے اس کے خلاف اقدام نہ کر سکیں اور اس طرح یہ علاقہ پرامن ہو جائے اور رہے۔ عربوں کو خوش کرنے کیلئے یہی کافی ہے کہ انھیں یہودیوں کے برابر کا درجہ مل گیا ہے اور انھیں بھی اسلحہ کی رسد پہنچنی شروع ہو گئی ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ اسلحہ کی اس دوڑ کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ مسلح امن کتنے دن کا مہمان ہوگا؟ یہودیوں کے عزائم عیاں ہیں وہ پہلے ہی اقوامِ متحدہ کے فیصلہ سے کہیں زیادہ حصۂ فلسطین ہتیا چکے ہیں۔ اس طرح نہ محض وہ اس غصب کا تحفظ ہی کر سکیں گے بلکہ توسیع کے منصوبے، جن سے وہ کبھی دستکش نہیں ہوئے، بروئے کار لاتے رہیں گے۔ اول تو یہودیوں کی موجودگی عربوں کے لئے کافی وجہِ ناراضی ہے، پھر ان کی توسیع مستقل دعوتِ پیکار ہوگی۔ لیکن تین بڑی طاقتوں کے پاس اس متوقع نقضِ امن کا علاج بھی ہے۔ وہ اقوامِ متحدہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایسی بدامنی کو قوت سے روکیں گی۔ گویا قوت کے بل بوتے پر یہودیوں کو فلسطین پر مسلط کیا گیا تھا اور قوت کے زور سے ہی انھیں مسلط رکھا جائے گا۔ ایسا کرنے میں اگر توجیعت اقوامِ متحدہ بطور آلۂ کار استعمال ہو گئی تو ٹھیک ورنہ براہِ راست فوجی مداخلت کر کے اس فتنہ کی سرکوبی کر دی جائیگی۔ اس اعلان نے ایک طرف اقوامِ متحدہ کو بے دست و پا کر دیا اور دوسری طرف آزاد عرب ممالک کا یہ حق بھی چھین لیا کہ وہ اپنے معاملات آزادانہ طے کر سکیں۔ اقوامِ متحدہ کو بالائے طاق رکھ کر دوسری اقوام کی آزادی سلب کرنے کا حق کس بین الاقوامی ضابطہ کی رو سے حاصل ہوا؟ اگر اقوامِ متحدہ کا استعمال اور حیثیت یہی کچھ ہے تو اس لاش کو بھی لیگ آف نیشنز کی قبر میں دفن کر دینا چاہیئے۔ پھر دولِ عظمیٰ کا راستہ بالکل صاف ہو جائے گا۔

یہ بیرونی عوامل عربوں کو بے دست و پا ہی نہیں بنا رہے بلکہ ان میں تفرقہ بھی پیدا کر رہے ہیں۔ اس تفرقہ کا اہم عنصر ہاشمی عنصر ہے جو دشمنانِ عرب کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ عرب لیگ نے باہمی اتحاد کو تقویت دینے کے لئے باہمی مؤثر کا معاہدہ طے کرنا چاہا جس کی رو سے بوقت حملہ ہر عربی حکومت کی مدد کی جاسکے اور بالآخر اس معاہدہ کا تصفیہ بھی ہو گیا لیکن سات ارکانِ لیگ میں سے پانچ نے اس پر دستخط کئے۔ عراق اور اردن نے اس پر دستخط نہیں کئے۔ اردن کی عدم شرکت کی وجہ ظاہر ہے جب امریکہ اور انگلستان اس کی پشت پر ہیں تو اسے کس کا ڈر ہے۔ عراق بھی ہاشمی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

عربوں کی سیاست میں ایک نازک موڑ آچکا ہے۔ انھیں تیسری عالمگیر جنگ کے جہنم کا ایندھن بنایا جارہا ہے یہ مسئلہ اس نوعیت سے عالمِ عرب کا ہی نہیں رہا بلکہ عالمِ اسلامی کا ہو گیا ہے۔ عربی جدید سیاست کے ناسوروں کی سمیّت تمام ممالک اسلامیہ پر اثر انداز ہوگی۔ یہ مقامی فتنہ "اسلامی" فتنہ بن کے رہے گا۔ دنیا دو متخالف احزاب میں بٹ چکی ہے۔ مسلمان اپنے مفاد کو نظر انداز کر کے کسی ایک بلاک کا بھی آلۂ کار بن گیا تو اس کے لئے تباہی مقدر ہوگی۔ دنیا کی مسلمان سلطنتیں باہم مل کر سیاسی تدبر اور بصیرت کا ثبوت دیں اور ایسی طویل المیعاد حکمت عملی وضع کر لیں جس کی بنیاد سر تا سر حقائق پر ہو تو ان کا مستقبل محفوظ ہونے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ یہ تدبر نوعِ انسانی کے لئے بھی نیک فال ہوگا۔

اس ضمن میں ان ممالک مسلم کا مسئلہ بھی نپٹایا جاسکتا ہے جو ابھی تک اغیار کے سیاسی غلام ہیں۔ حال ہی میں ٹیونس کے آزادی خواہوں نے پاکستان مسلم لیگ سے اپیل کی ہے کہ وہ آزادی طلبی میں ان کی امداد کرے۔ اسلامستان کے چودہری خلیق الزماں نے اس پر فیصلہ کیا ہے کہ وہ ممالکِ اسلامیہ کی غیر سرکاری جماعتوں کی ایک کانفرنس طلب کریں گے اور اس مسئلہ پر مناسب غور و خوض کریں گے۔ ان مسائل پر باہمی غور و خوض کا فیصلہ مستحسن ہے لیکن یہ سرکاری اور غیر سرکاری کا امتیاز غیر مستحسن ہے۔ خود خلیق الزماں کی طرف ایسے فرق کا اظہار تعجب انگیز ہے۔ وہ اس سیاسی پارٹی کے صدر ہیں جو پاکستان بھر میں حکمراں ہے۔ جب حکومت کی باگ ڈور ان کی اپنی پارٹی کے ہاتھ میں ہے تو پھر سرکاری اور غیر سرکاری کی گفتگو کیا معنی رکھتی ہے۔ مزید برآں غلام مسلمانوں کا معاملہ بین الاقوامی ہے اور اس کا حل جمعیت اقوام متحدہ کی وساطت سے ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام حکومتوں کے کرنے کا ہے نہ کہ غیر سرکاری پارٹیوں کا۔ لہٰذا ہم چودہری صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ مجوزہ اجتماع کی زحمت نہ فرمائیں، صرف اپنی حکومت کو اس ضرورت کا احساس دلائیں تاکہ حکومت پاکستان دوسری مسلم حکومتوں سے مناسب بحث و تمحیص کرے اور اس طرح مسلم بلاک ایک معین لائحہ عمل کے مطابق ان بھائیوں کو آزاد کرائے جو بدستور اغیار کے سیاسی غلام ہیں۔ غیر سرکاری اجتماعات سے ہو سکتا ہے کہ غیر سرکاری حضرات کی قیادت کی راہیں کشادہ ہو جائیں، لیکن ہمارے غلام بھائیوں کی مشکلات حل نہیں ہوں گی۔

مغربی یورپ

روس کے خلاف مغربی یورپ کے ممالک کو قریب تر کرنے کی جو تجاویز پیش ہو رہی ہیں ان میں (مغربی) جرمنی کا مقام اہم حیثیت رکھتا ہے۔ مشرقی جرمنی میں روس نے پچاس ہزار کی مسلح پیپلز پولیس قائم کر لی ہے۔ مغربی طاقتوں نے اس اقدام کو تخفیفِ اسلحہ کے ان معاہدات کی خلاف ورزی کہا ہے جو چار بڑی طاقتوں میں ہو چکے ہیں۔ مغربی طاقتوں کے سامنے اب یہ سوال ہے کہ جرمنی کو مسلح کیا جائے یا اپنا (غیر جرمن) فوجی تسلط غیر معین عرصہ تک جاری رکھا جائے۔ کم از کم فرانس سابقہ تلخ تجربات کی روشنی میں، مسلح کرنے کے حق میں نہیں ہو سکتا۔ فرانس اس جگر خراش حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتا کہ پچھلی دو بڑی جنگیں اس کی سرزمین پر لڑی گئی ہیں۔ دوسری صورت ... (غیر جرمن فوجی تسلط) جرمنوں کے لئے خوش آئند نہیں ہو سکتی۔ مغربی یورپ کی برادری میں مغربی جرمنی پورا حصہ لینا چاہتا ہے۔ مغربی ممالک نے جرمنی کی وحدت کی جو تجاویز آزاد انتخابات اور روس کی تشکیل کردہ پیپلز پولیس کو غیر مسلح کرنے کی شرائط پر پیش کی تھیں وہ روس نے مسترد کر دی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو شرائط روس پیش کرتا ہے انھیں مغربی ممالک تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اگر مغربی جرمنی مغربی یونین کا رکن بن جائے تو جرمنی کی تقسیم دائمی ہو جائے گی۔

مسلح جرمنی کے بغیر مغربی ممالک مشرق کی طرف سے ہونے والے حملہ کو روک نہیں سکتے۔ مغربی جرمنی میں غیر ملکی فوجیں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتیں۔ جرمن نیشنلزم کی رفتار تیز تر ہو رہی ہے۔ یہ نیشنلزم مطالبہ کرے گا کہ جرمن افواج کو بھی ایسے دفاع کی ذمہ داری میں شریک کیا جائے۔ جرمنی سابقہ اتحادیوں کی باہمی بداعتمادی کے ہاتھوں پھر مسلح ہوتا نظر آتا ہے۔ کیا پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا تجربہ جس کا نتیجہ دوسری جنگ کی صورت میں نکلا پھر سے دوہرایا جائے گا۔

اواخر مئی میں مغربی یونین کو زیادہ مربوط کرنے کی طرف وہ اہم قدم اٹھایا گیا جسے شومان تجاویز سے موسوم کیا گیا ہے۔ فرانس کے وزیر خارجہ موسیو شومان کی تجویز یہ ہے کہ مغربی یورپ کی کوئلے اور لوہے کی صنعت کا کنٹرول ایک مشترکہ ہیئت کے سپرد کر دیا جائے جو اس مقصد کے لئے قائم کی جائے۔ فرانس کی یہ تجویز دراصل نتیجہ ہے اس تلخ تجربہ کا جو فرانس کو گذشتہ دونوں جنگوں میں آزادی کھو کر حاصل ہوا۔ وہ اس کا اعادہ نہیں چاہتا۔ فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ اور لکسمبرگ نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے۔ شروع شروع میں برطانیہ نے بھی اس کا خیر مقدم کیا لیکن ۲۲ روز بعد جب اسے منصوبہ بندی کے مذاکرات میں شمولیت کی دعوت دی گئی تو اس نے ان میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ شروع میں برطانیہ کو خیال تھا کہ اس سے فرانس اور جرمنی کا تاریخی نزاع ختم ہو جائے گا۔ اسے یہ خیال نہ تھا کہ اسے بھی اس میں شریک ہونا پڑے گا۔ چنانچہ جب اسے ادغام میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا

برطانیہ یہ چاہتا ہے کہ اس سے اس کی مخصوص ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ لیکن فرانس کا مقصود یہ ہے کہ برطانیہ کو مغربی یورپی برادری کے ساتھ زیادہ مضبوطی سے نتھی کر دیا جائے۔ برطانیہ اپنی اہم صنعتوں، کوئلہ اور لوہا پر کنٹرول کے خود مختارانہ اختیارات مجوزہ بالا ہیئت کو سپرد کرنے پر آمادہ نہیں۔ اسے خطرہ ہے کہ دوسرے ممالک کے غیر ترقی یافتہ معاشی نظاموں کے ساتھ وابستہ ہونے سے اس کا ترقی یافتہ اور منظم نظام بے کار ہو جائے گا۔ اس شبہ کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ شومان کا مقصود یہ ہے کہ امریکہ اور روس کے درمیان ایک تیسری طاقت پیدا کر دی جائے۔ اگر اس طرح کا ایک بلاک قائم ہو جائے جس میں برطانیہ کا کوئی دخل نہ ہو تو وہ یورپ سے بے دخل ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے نتائج برطانیہ کی موجودہ حکومت کے لئے اچھے نہیں ہو سکتے۔ اس تجویز کی تفاصیل طے کرنے کے لئے پیرس میں چھ ملکوں کی کانفرنس شروع ہے۔ برطانیہ اس میں شریک نہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا ۲۶ مئی کو "جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں گہرے روابط قائم کرنے کی خاطر باہم سیاسی، معاشی اور ثقافتی اشتراکِ عمل کے مناسب وسائل تلاش کرنے کے لئے" جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی بحرالکاہل کے سات ممالک کی ایک کانفرنس فلپائن کی گرمائی آرام گاہ باگیو میں منعقد ہوئی۔ اس میں فلپائن، آسٹریلیا، ہندوستان، پاکستان، لنکا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ نے حصہ لیا۔ آج سے سوا سال پیشتر نیشنلسٹ چین، جنوبی کوریا اور فلپائن کے لیڈروں نے معاہدۂ اوقیانوس کے نمونہ پر روس اور کمیونزم کے خلاف معاہدہ بحرالکاہل کی تجویز پیش کی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ امریکی اسلحہ اور ڈالر حاصل کئے جا سکیں۔ یہ تجویز بعد میں ترک کرنی پڑی اور اس کی جگہ یہ کانفرنس بلائی گئی۔ صدارت کے فرائض فلپائن کے وزیر خارجہ اور اقوامِ متحدہ کے صدر رومولو نے سرانجام دیئے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ جنوب مشرقی ایشیا کے اندرونی تحفظ کے لئے ایک مستقل علاقائی تنظیم کی جائے گی۔ کانفرنس کا ایک مقصد یہ بتایا گیا کہ جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی بحرالکاہل کے ممالک کی ایک اقتصادی یونین قائم کی جائے گی "جس کے دائرہ سے فوجی امور خارج ہوں گے"۔

اس کانفرنس کے چند روز بعد فلپائن کے صدر قرینو نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ فلپائن دوسرا چین نہیں بنے گا۔ اس نے کہا:-

> اس چیز کی ضرورت کبھی بھی پیش نہیں آئے گی کہ امریکہ اندرونی تحفظ کے خیال سے فلپائن کو واپس لے لے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ امریکہ یہ شبہ پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ وہ (امریکہ) پھر سامراج کی طرف مائل ہو رہا ہے۔

باگیو کانفرنس کے ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ملایا کے متعلق برطانیہ کی تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔ حال ہی میں برطانیہ کے وزیر جنگ اور وزیر نوآبادیات نے ملایا کا دورہ کیا۔ وزیر نوآبادیات، جیمز گرفتھس نے اپنے دورہ کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملایا میں صورتِ حالات پر قابو پا لیا جائے گا لیکن وہ کام ہے "سخت کٹھن"۔ ۳۰ مئی ۱۹۵۰ء کو ڈیلی ٹیلیگراف نے ان خیالات کا اظہار کیا۔

> ملایا کی جنگ انتہائی نازک مرحلہ پر پہنچ چکی ہے۔ اسے ہر قیمت پر جیتنا چاہئے۔ ملایا پر کمیونسٹوں کے قبضہ سے جنوب مشرقی ایشیا اور اس سے آگے مغربی طاقتوں پر تباہ کن اثر پڑے گا۔ جلد تر فتح حاصل کرنے کی خاطر جو سامان بھی درکار ہو اس کی فراہمی کا بندوبست کر لینا چاہئے۔ یقین ہے کہ بحرالکاہل کی نوآبادیات بڑی خوشی سے اپنا حصہ ڈالنے کو تیار ہوں گی۔

ہند چینی کی صورتِ حال بھی بدستور پریشان کن ہے۔ سائیگان کے سیاسی حلقوں کا اندازہ ہے کہ ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ تعداد ۱۹۴۷ء کی تعداد کے چھ گنا سے بھی زیادہ ہے۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنا محاذ بدل لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ پارٹی کے خیال میں "موجودہ حالات میں متشددانہ کاروائی سے اقتدار حاصل کرنا ممکن نہیں" اس لئے حکومت کی متشددانہ مخالفت ترک کر کے تمام انتہا پسند جماعتوں کو ایک متحدہ محاذ میں منظم کیا جائے تاکہ یہ محاذ آئندہ انتخاباتِ عمومی میں حصہ لے سکے۔

۵ رجون کو امریکہ کے وزیر دفاع، لوئی جانسن نے ایوانِ اعلیٰ کی تعلقاتِ امورِ خارجہ اور مسلح محکموں کی کمیٹیوں سے اپیل کی کہ وہ اسلحہ کے امدادی پروگرام کی منظوری دیدے "تاکہ روس کی طاقت کا جواب طاقت سے دیا جا سکے"۔ غیر کمیونسٹ ممالک کو مسلح کرنے کے پروگرام کا خاکہ پیش کرتے ہوئے مسٹر جانسن نے ہند چینی، انڈونیشیا، فلپائن، کوریا، ایران، ترکی، یونان، مغربی یورپ اور اوقیانوسی ممالک کا نام لیا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے متعلق اس نے کہا:

> فلپائن اور مشرقِ بعید کی اہمیت میں امریکہ کی دلچسپی سے ہم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی صورت یہی ہے کہ اس علاقے میں کمیونزم کو کامیابی سے روکا جائے۔

مساعیٔ امن جنگی تیاریوں کے اس پس منظر میں اقوامِ متحدہ کے جنرل سکریٹری ٹرگوے لی مشرق و مغرب کی سرد جنگ کو کم کرنے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے اکابر سے ملاقاتیں کرنے کے بعد، ۶ رجون کو انہوں نے اقوامِ متحدہ کے ارکان کو دس نکات پر مشتمل امن کا ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ اقوامِ متحدہ کے

صدر رومولو نے بھی ۲۷ مئی کو اعلان کیا ہے کہ وہ "سرد" جنگ کی شدت کو کم کرنے کے لئے ماسکو جانے کا خیال کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ایوانِ اعلیٰ کے ایک ری پبلیکن رکن 'ٹیفٹ' نے کہا ہے کہ

> معاہدۂ اوقیانوس کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے سے جنگ کے امکانات زیادہ ہو رہے ہیں۔ مغربی یورپ کے ممالک مسلح کرنے پر کروڑوں روپے صرف کرنے کا مطلب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ جنگ یقینی ہے۔

مسٹر لی کوشش کر رہے ہیں کہ روس نے اقوام متحدہ کا جو مقاطعہ کر رکھا ہے وہ ختم ہو جائے۔ امریکی وزیر خارجہ ڈین ایچیسن نے وعدہ کیا ہے کہ امریکہ کمیونسٹ چین کو اقوامِ متحدہ میں شامل کرنے کے سوال پر اپنا حق استرداد (ویٹو) استعمال نہیں کرے گا۔ فرانس نے بھی اسی قسم کا اشارہ کیا ہے۔ مسٹر لی نے مجلس تحفظ کے چھ چھوٹے ارکان سے گفتگو شروع کی ہے تاکہ کمیونسٹ چین کے داخلہ اقوامِ متحدہ کی راہ ہموار کی جا سکے۔ اب تک مجلسِ تحفظ کے گیارہ ارکان میں سے کمیونسٹ چین کو تسلیم کر چکے ہیں۔ مسٹر لی نے ماہ مئی میں مسئلہ چین کے حل کی آخری تاریخ "جون یا جولائی" پیش کی تھی۔ ان کے اس یقین کا سبب (اغلباً) یہ ہے کہ جون میں ہندوستان اور جولائی میں ناروے مجلسِ تحفظ کی صدارت کر رہے ہیں۔ یہ دونوں ممالک نئے چین کو تسلیم کر چکے ہیں۔ ماہ اگست میں صدارت روس کے حصہ میں آجائے گی۔ یہ "موافق" صدارتیں کمیونسٹ چین کے داخلہ کے لئے سازگار ہیں۔ صدر چھوٹی چھوٹی اصطلاحی دقتوں کو بآسانی رفع کر سکتا ہے۔ امریکہ کے اخبارات نے مسٹر لی پر سخت لے دے کی ہے۔

امریکہ کے اس پیچ و تاب کا سبب یہ ہے کہ نومبر میں امریکہ کے ایوانِ اعلیٰ (سینیٹ) کا انتخاب ہو رہا ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی کی واحد کوشش یہ ہے کہ اس میں ڈیموکریٹ جیت جائیں۔ ری پبلیکن سینیٹ ہر اس شخص پر کمیونسٹ ہونے کا الزام عائد کر رہے ہیں جو مسئلہ چین کے متعلق صحیح رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس لئے امریکہ کا برسرِ اقتدار طبقہ اس مسئلہ کو انتخاب تک اٹھا رکھنا چاہتا ہے۔ اقوامِ متحدہ میں امریکہ کے نائب نمائندہ نے کہا ہے کہ امریکہ روس سے اس وقت تک کوئی بات نہیں کرے گا جب تک وہ اقوامِ متحدہ کا مقاطعہ ترک کرنے کا اعلان نہ کر دے۔ اقوامِ متحدہ میں برطانوی نمائندہ، الیگزینڈر کیڈوگن کی رائے کے مطابق اعصابی جنگ کو ختم ہونے تک کئی نسلیں گذر جائیں گی۔ شکوک و شبہات کی موجودہ فضا میں یہ رائے حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔

قرآن — اور — حدیث

(از علامہ اسلم جیراجپوری)

معاصر فاران نے پچھلے دنوں طلوعِ اسلام کے بعض مضامین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس امر پر بہت زور دیا کہ قرآن کی تفسیر کے لئے حدیث ناگزیر ہے۔ اسی ضمن میں علامہ اسلم جیراجپوری کی ذاتِ گرامی پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی گئی، محض اس جرم کی پاداش میں کہ ان کے تبحر علمی نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ حدیث ظنی ہے اور قرآن یقینی۔ اور یقین کے مقابلہ میں ظن کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اتفاق سے فاران کے پرچے علامہ موصوف تک بھی پہنچ گئے اور انھوں نے مختصر سا تبصرہ اپنے مخصوص انداز میں مدیر فاران کی طرف ایک خط کی صورت میں بھیجا۔ یہ خط جون کے فاران میں شائع ہوا ہے اور ہم اسے معاصر موصوف کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں:

آپ کا ماہنامہ "فاران" جامعہ کے دارالمطالعہ میں آتا ہے، اس کے دو نمبر مارچ اور اپریل ۱۹۵۰ء کے میرے ایک شاگرد میرے پاس لائے جن میں آپ نے حدیث کی حمایت میں اپنا ایک بسیط مضمون شائع کیا ہے اور اس میں میرا نام بھی لیا ہے۔

آپ نے کیا لکھا؟ کیسا لکھا؟ اور کیوں لکھا؟ ان چیزوں پر میں گفتگو نہیں کرتا۔ ہاں یہ میں نے دیکھا کہ آخر میں آپ صحیح نتیجہ پر پہنچ گئے، یعنی اپریل ۱۹۵۰ء کے فاران کے صفحہ ۵ میں آپ نے لکھا ہے کہ

"یقیناً" یہ بات اپنی جگہ صحیح اور درست ہے کہ قرآن کی آیتیں یقینی اور رسول اللہؐ کی احادیث "ظنی" ہیں۔

یہی بات بڑے بڑے ائمہ حدیث نے بھی کہی ہے اور اصولیین نے بھی حدیثوں کی صحت کو "ظنی" ہی جانا ہے، یقینی نہیں کہا ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے:-

هذا كله ما يظهر للمحدثين من حيث نظرهم الى الاسناد والا فلا مطمع للقطع لتجويز العقل ان يكون الصحيح فى نفس الامر موضوعا والموضوع صحيحاً۔ (موضوعات کبیر ص۱۶)

یہ سب کچھ وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے، ورنہ یقین کی کوئی شکل نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے

کہ جس کو انھوں نے صحیح کہا ہے وہ حقیقت میں موضوع ہوا در جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

یعنی صرف حدیثیں ہی ظنی نہیں، بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے، تو اب منطقی شکل اس کی یہ ہوئی

مقدمہ اول — حدیثیں ظنی ہیں

مقدمہ دوم — ظن کی پیروی قرآن کی رو سے منع ہے۔

نتیجہ — حدیثوں کی پیروی قرآن کی رو سے منع ہے۔

پہلا مقدمہ یعنی حدیثیں ظنی ہیں آپ کو تسلیم ہے، دوسرے مقدمہ کی دلیل قرآن کی حسب ذیل آیتیں ہیں:-

وما یتبع اکثرھم الا ظنا — ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔ (سورۂ یونس رکوع ۴)

اور ان میں اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن تو حق کی جگہ کچھ بھی کارآمد نہیں۔

قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون (پارہ ہشتم رکوع ۵)

پوچھ کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لئے نکالو تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور بس اٹکل دوڑاتے ہو۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون (پارہ ہشتم رکوع ۱۶)

اور روئے زمین کے اکثر (لوگ ایسے) کہ ان کی جو تم اطاعت کرو گے وہ تم کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے وہ تو صرف ظن کے پیرو ہیں اور بس اندازے لگاتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتیں پیش کی جا سکتی ہیں، جن میں ظن کی پیروی کو نہ صرف ممنوع کہا ہے بلکہ گمراہی کا موجب بتایا ہے، قرآن یقین سے کم کی پیروی کا مطلق روادار نہیں ہے۔

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا (سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۴)

اس کے پیچھے نہ چل جس کے نتیجہ کو علم (یقین) نہیں۔ کیونکہ سمع، بصر اور قلب ہر ایک سے اس کی بابت سوال ہوگا۔

اہل سنت کے نزدیک حدیث کی چھ کتابیں ہیں جو صحاح ستہ بولی جاتی ہیں، مقبول ہیں، ان کے مولفین کے وفاتوں کے سنین یہ ہیں، امام بخاری ۲۵۶ھ، امام مسلم ۲۶۱ھ، ابن ماجہ ۲۷۳ھ، ابو داؤد ۲۷۵ھ، ترمذی ۲۷۹ھ، نسائی ۳۰۳ھ یعنی یہ سب تیسری صدی ہجری کے آخر کے لوگ ہیں، ان میں جو روایتیں ہیں وہ بالعموم پانچ یا چھ یا کبھی اس سے بھی زیادہ یا اس سے بھی کم راویوں کے توسط سے آتی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے سنا زید سے، اس نے سنا تھا عمرو سے، اس سے بیان کیا تھا بکر نے، اس کو خبر دی تھی خالد نے، اس سے کہا تھا اصغر نے، اس نے سنا تھا اکبر سے! خبر، درخبر، درخبر

درخبر، درخبر، جو نہ علم ہے نہ شہادت ہے، ایسی انسانی روایت درروایت، درروایت، درروایت، درروایت پر جس دین کی بنیاد ہوگی وہ تو بہت کمزور ہوگا، یہ مانا کہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ یہ رواۃ ثقہ تھے لیکن باوجود اس کے غلطی ـــــ غلط فہمی، خطا ونسیان سے بری نہ تھے، پھر ان کی روایات کی ضمانت کیا ہوئی، قیامت کے دن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ حدیثوں کے متعلق کہہ دیا کہ میں نے ان کو نہیں بیان کیا تھا، یا میرے کہنے کا یہ مطلب نہ تھا یا یہ میرے الفاظ نہیں تو اس وقت کیا جواب ہوگا۔ الغرض حدیث کی حمایت کا جو جوش آپ نے دکھایا ہے وہ اس وجہ سے کہ آباء عن جد اس کے خوگر چلے آتے ہیں، حقیقت فہمی کی بنیاد پر نہیں ہے، یہ وہی جذبہ ہے جس کو قرآن نے بار بار کہا ہے:

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اٰباءنا (سورۂ لقمان رکوع ۳)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس پر چلو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے

علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نے جہاں اپنا طویل وعریض مضمون اپنے رسالہ میں چھاپا ہے یہ میرا مختصر عریضہ اس میں شائع فرمادیں ـــــ حاشیہ میں آپ کو اختیار ہے جو کچھ چاہیں لکھیں، لیکن قرآن کی اس آیت کو پیش نظر رکھیں اور ضمیر کو دھوکا نہ دیں۔

بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ (سورۂ قیامہ رکوع ۱)

انسان اپنے نفس کو دیکھ رہا ہے گو وہ اپنے عذرات پیش کرتا ہے۔

حدیثوں کو آپ دین مانتے ہیں تو مانئے، لیکن ان کو غیر یقینی سمجھتے ہوئے دینی حجت کے طور پر پیش کرنے کا حق نہیں رکھتے، وہ صرف دینی تاریخ ہیں، قرآن کی روشنی میں ان سے احتیاط کے ساتھ دینی تاریخ کا کام لیا جاسکتا ہے۔

محمد اسلم جیراجپوری جامعہ نگر، دہلی ۱۳ اپریل ۱۹۵۰ء

ـــــ ہر قوم میں ـــــ خدا کے بھیجے ہوئے رسول آتے رہے اور ـــــ بھٹکی ہوئی انسانیت کو ـــــ منزلِ مقصود کی طرف کشاں کشاں لے جاتے رہے ـــــ ہر نبی کی دعوتِ انقلاب ـــــ عبرت آموز و بصیرت افروز داستانِ عروج وزوال ہے ـــــ ان تمام انقلابات کی تفصیل قرآنی نقطۂ نگاہ سے ـــــ

تاریخِ رسالت

میں دیکھئے۔ مصنفہ پرویز

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ رالسن روڈ۔ کراچی

پرویز صاحب

قارئین کرام بادی النظر ہی میں اس اشاعت میں یہ نمایاں کمی محسوس فرمائیں گے کہ اب کے پرویز صاحب کا کوئی مضمون شریکِ اشاعت نہیں۔ خود ادارۂ طلوع اسلام کو قارئین سے کہیں زیادہ اس افسوسناک کمی کا احساس اور دکھ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے حالات نے اس کمی کو ناگزیر بنا دیا۔ پرویز صاحب کے شب و روز جس والہانہ جذب و انہماک سے قرآن کے مطالعہ اور تفکر میں گزرتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ کثرتِ کار کے باعث ان کی صحت ایک عرصے سے خراب چلی آرہی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ قلب اور جسم کی آویزش میں جسم کے تقاضوں کا استخفاف کیا ہے۔ سوءِ اتفاق سے ان دنوں ان کی صحت زیادہ خراب ہوگئی اور ڈاکٹروں کے مشورے پر انھیں نہ محض شغل تحریر عارضی طور پر ترک کرنا پڑا بلکہ تبدیلی آب وہوا اور آرام کے لئے کراچی سے باہر تشریف لے جانا پڑا۔ چنانچہ ان دنوں آپ کراچی میں نہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو کر بزمِ طلوع اسلام میں شریک ہو سکیں۔ خدا کرے ان کی غیر حاضری ایک اشاعت سے آگے نہ بڑھے۔

—ادارہ طلوع اسلام—

رسول اللہ صلعم

کے متعلق ہم کہتے تو ہیں کہ "کان خلقہ القرآن" یعنی آپ کے اخلاق کا اندازہ کرنا ہو تو قرآن کو دیکھئے

لیکن

کتنے ہیں جنھوں نے واقعی قرآن میں اخلاقِ رسولؐ کو تلاش کیا ہے۔

جناب پرویز نے کوئی پچیس سال کی غواصی کے بعد قرآن کے سمندر سے سیرت کے بے بہا موتی تلاش کئے ہیں اور اپنی کوشش کا ماحصل

معراجِ انسانیت

کی شکل میں پیش کیا ہے۔ موتیوں کی اس مالا کو دیکھئے اور کان خلقہ القرآن کا مفہوم سمجھئے

ادارہ طلوعِ اسلام
رالسن روڈ۔ کراچی

اقبال اور قرآن

نہیں کہہ سکتے کہ اقبالؒ پر یہ کتاب نوعیت کے اعتبار سے آخری کتاب ہوگی لیکن یہ ضرور ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اقبال پر یہ کتاب پہلی ہے۔ جناب عارف بٹالوی کی یہ کوشش (کتاب) فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ یہ کتاب چار نادر عنوانات پر مشتمل ہے۔ کلام اقبال و کلام خدا۔ (۲) اسلام میں زندگی کا تصور، (۳) خودی اور قرآن (۴) اقبال اور کائنات۔ آپ زندگی کے کسی گوشے کے متعلق سوال کریں جواب میں یہ کتاب دل کے اطمینان کے سامان فراہم کریگی۔ آج کے بدلتے حالات میں اس کا مطالعہ اور بھی ضروری ہے جبکہ ہر مسلمان زندگی کو قرآن میں سے تلاش کر رہا ہے۔

کتاب ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے مجلد اور حسین گردپوش۔

قیمت پانچ روپے

طلوع اسلام کے خریداروں اور کتاب لمیٹڈ کے حصہ داروں سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا۔

آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ یہ ملی ادارہ کس قدر سلجھا ہوا لٹریچر پیش کرنا چاہتا ہے اگر آپ اس میں بہ حیثیت حصہ دار شریک ہو جائیں تو ہر لحاظ سے منافع میں رہیں گے معلومات کے لئے خط لکھیں۔

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

کچھ نئی کتابیں

اقبال اور قرآن	عارف بٹالوی	۵-۰-۰
دو آنسو (زیر طبع)	"	۴-۰-۰
آگ اور خون (ناول)	"	۴-۰-۰
عشرت (ناول)	"	۲-۸-۰
امیر پاکستان	"	۲-۸-۰
ٹیگور اور اقبال (زیر طبع)	"	
جنت میں مشاعرہ	"	۳-۸-۰
محمود و ایاز (زیر طبع)	"	
پہلی رات "	"	
خطبات لیاقت "	"	
شباب سے پہلے۔ ۳۵ مشاہیر		۴-۸-۰
گنجینۂ جوہر	مولانا محمد علی جوہر	۲-۸-۰
آخری لمحات قائداعظم		۲-۰-۰
سوشلزم اور اسلام		۲-۰-۰
معارف القرآن جلد اول	(پرویز)	۱۰-۰-۰
" جلد دوم	"	۱۰-۰-۰
تاریخ رسالت	"	۱۵-۰-۰
معراج انسانیت	"	۲۰-۰-۰

کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے

اس لئے ایسے قیمتی لمحات کو ضائع نہ کیجئے۔ ذرا سوچئے کہ اگر آپ کو ضروریات کی
مختلف چیزیں خریدنی ہوں تو ان کی تلاش میں آپ کا کس قدر وقت صرف ہوگا
اور پریشانی کتنی اٹھانی پڑے گی۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں آپ کو

ایک ہی جگہ مل جائیں

جو بہترین ہوں اور قیمتیں نہایت واجبی۔ تو آپ کا کس قدر قیمتی وقت
اور پریشانی بچ جائے گی

ہمارے ہاں

ضروریات کا ہر قسم کا انگلش اور جاپانی مال، قسم قسم کا ٹائلٹ کا سامان، سنڈریز
(باورچی خانے کی چھوٹی موٹی تمام چیزیں)، سائیکل، بسکٹ، انگریزی مٹھائی وغیرہ
مناسب نرخوں پر فروخت ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تشریف لائیے۔ دیکھئے
آپ کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔

احمد اینڈ احمد کمپنی۔ سرائے روڈ۔ (نزد سندھ مدرسہ) کراچی ۲

Time commands Business
LIMTON commands Time

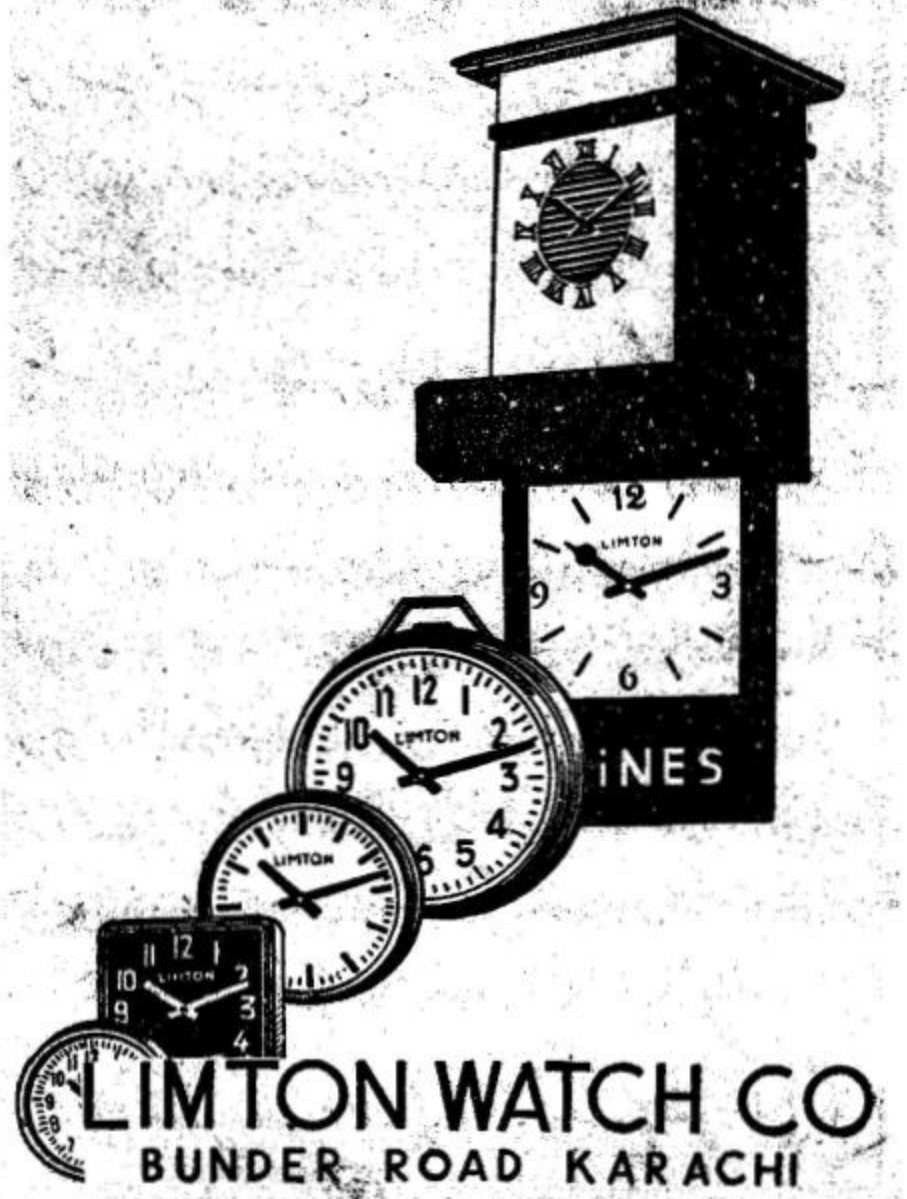

LIMTON WATCH CO
BUNDER ROAD KARACHI